

2020ء

اپریل

لاہور

ماہنامہ انٹرنیشنل

سرپرست اعلیٰ
و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ



ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان



www.lahoreinternational.com

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address

Private UK Pension Tracing

Personal Income Tax Return investigations

Assets Review for Inheritance Tax

Rental Income Tax Returns

Appealing - Past years HMRC Penalties

UK State Pension Entitlement Review

Preparation / Filing of prior year tax returns

Advise on filling Gaps in UK State Pension

Duplicate - Payslips / P60s

UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN,

SURREY SM4 5HP - UK



CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM

WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

دریں قارکر	04
دنیا کے لئے کرونا وائرس انذار و تنبیہ	05
و سعیت اللہ خان کی خصوصی تحریر: سوسالٹ شیخ مجتبی اور آج کا پاکستان	06
بلوج تاریخ کے آئینے میں	10
چور اباز ارلدھیانہ سے شاہین باغ دلی تک	12
مولوی، عورت مارچ اور کرونا وائرس	14
زیندگی مودی، ختم نبوت اور جمہوریت	15
کرونا اور ہماری معاشرتی اقدار	17
پنجابی، پنجابی بولنے سے کیوں شرماتے ہیں	18
حاجی رچڈ برلن	20
امریکہ طالبان معاہدہ افغانستان میں امن کی حمانت نہیں دیتا	21
کیا دفاتر میں ٹھیک نہ رکھا ہیک ہے؟	23
انسان نے کیسے اور کیوں بولنا سیکھا؟	25
دمی کے شیخ محمد نے بیٹیوں کو غنو اکیا، بیوی کو دھمکایا، برطانوی ہائی کورٹ	27
دلی دیکھی؟ اور دیکھو گے؟	28
کرونا وائرس: اس بیماری کی علامات کیا ہیں اور اس سے کیسے محفوظ رہا جائے؟	29
دوستودسری جنگ عظیم زوروں پر تھی	31
"بھارتی قوم پر تاریخ کے نام پر بحث مسلط ہو چکے"	32
ساماجی سرگرمیوں کی خاطر بلگیٹس مائنکرو سافت کے بورڈ سے مستعفیٰ	38
کرونا وائرس کا علاج۔ سائنس سے کیا جائے یاد ہب سے؟	39
سانحہ پھی سنگھ پورہ شیخ بھارتی ریاستی ہشتنگر دی	41
آسٹریلیا کے سکولوں میں 200 سال سے جاری مذہبی تقریروں کا خاتمه: منظروں پر منظر	43
بھارت: ہندو مسلم فسادات، وہی قاتل وہی منصف	46
ہندوستان کے اردو ادب کا بطل جلیل	48
"ٹوچ فون" (ب، پ، چ، ح، گ اور ل) کی ایک ناقابل اشاعت کتابی	52
پڑی ہوئی کتابیں یا پڑھی ہوئی کتابیں؟	53
پچاس برس پہلے ملائیت کا انجم بتانے والا فن پارہ: غلام عباس کا شاہکار افسانہ "دھنک"	54
افسانہ: تھامی کا بینگن	57
عورت ایک مُمّتا، ایک پیلی یا انسان---؟	59
دنیا بھر میں کرونا کے مریض اب آٹھ لاکھ سے زائد	62

ADVERTISEMENT TARIFF (Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

بعد از خدا بعضی محمد نجم مگرایں بود مخدود استھن کا فرم
ہوا ناصر



علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذهبی سرگرمیوں کا عالمی مجلہ
جلد نمبر: 3 شمارہ نمبر 1 جمادی الاول 1441 جنوری 2020ء

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی
سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈٹر
انچارن گوشہ ادب

مدڑہ عباسی
محی الدین عباسی

سید مبارک احمد شاہ (بادوے)	+92-91698367
بلال طاہر (کراچی، پاکستان)	+92-3327051887
عرفان احمد خان (جمنی)	+49-1711974701
حاجی میاں محمد وقار یعقوب (نمایندہ جوہی پہنچ پاکستان)	+92-300-6912-273
ظہیر الدین عباسی (جمنی)	+49-15212005548
چودہ ری مقبول احمد (بھارت)	+91-9988489365
محمد سلطان قریشی (کینیڈ)	+41-6433112
امن الامن (برطانیہ)	+44-7940077825

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤ نڈر

website : lahoreinternational.com
اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:
lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین ایٹر نیشنل آپ کا پناہ سالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھر پور حصہ ڈالیے۔

درستِ قرآن کریم



وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللَّهِ لَهُمْ لَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ يُضْلَلُوكُ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَلَا آنفُسُهُمْ وَمَا يَضْرُونَكَ مِنْ شَيْءٍ طَوْبَانٌ وَآنَزَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَيْكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ طَوْبَانٌ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا۔

(النساء: 114)

ترجمہ: اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتے تو ان میں سے ایک گروہ نے تو ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ ضرور تجھے گمراہ کر دیں گے۔ لیکن وہ اپنے سوا کسی کو گمراہ نہیں کر سکے۔ اور وہ تجھے ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتارے ہیں اور تجھے وہ کچھ سکھایا ہے جو تو نہیں جانتا تھا۔ اور تجھ پر اللہ کا فضل بہت بڑا ہے۔

(ترجمہ از حضرت خلیفۃ المسیح الرابع)

تشریح: میں تم کو قرآن شریف سناتا ہوں۔ مدعا اس سے میرا یہ ہوتا ہے کہ تم اس پر عمل کرو اور عمل کر کے اس سے نفع اٹھاؤ۔ قرآن کریم پر عمل کرنے سے انسان کے آٹھ پھر خوشی سے گزرتے ہیں۔ قرآن شریف پر عمل کرنے سے انسان کو خوشی و عزت اور کم سے کم بندوں کی اتباع اور محتاجی سے نجات ملتی ہے۔

آن یُضْلُلُوكَ: خبردار ہو جاؤ ایک گروہ اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ تم گمراہ ہو جاؤ۔

وَمَا يَضْرُونَكَ مِنْ شَيْءٍ : اگر تم قرآن شریف پر توجہ رکھو تو تم گمراہ کرنے والوں کی کوششوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ یورپ والوں نے کس قدر ترقی کی ہے لیکن دیکھو ایک بندہ کو خدا بنا لیا۔ آریہ وَحَدَّهُ لَا شَرِيكَ لَهُ نہیں کہہ سکتے۔

وَعَلَيْكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ : دیکھو نبی کریمؐ ایسے انسان کو ارشاد ہے کہ اگر قرآن شریف نہ آتا تو تجھ کو کچھ نہ آتا۔ بھلانی اور برائی سمجھنے کا ایک ہی ذریعہ: قرآن شریف ہے۔

كَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا : اللہ تعالیٰ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کو عظیم فرماتا ہے اور ان پر جو فضل ہوا اسے بھی عظیم فرمایا۔ اب خیال کرو کہ جس کو خدا تعالیٰ نے عظیم کہا وہ کس قدر عظیم الشان ہو گا۔ اب جو رسول اس شان کا ہے اس کے بغیر ہم کو کسی اور کے مقندا (امام) بنانے کی ریجھ (چاہت) بھی کیا ہوئی۔

{حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ 57}



مدیر اعلیٰ محبی الدین عبایی

اداریہ کرونا وائرس انڈر ارڈینیشن دنیا کے لئے

کرونا وائرس چین کے شہر ووہان سے پھیلنے والی زمینی وبا نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ وباً یہاں 1990ء ممالک میں پھیل چکی ہے۔ عالمی ادارہ صحت نے کوڈ 19 (Covid) کو عالمی وبا قرار دیا ہے۔ دنیا کے ذرائع ابلاغ میں اس بیماری کا جتنی تیزی اور وسیع پیمانہ پر تشویہ ہوئی ہے اس پر ہر ملک کا ہر فرد اس سے خوف زدہ ہے۔ کیا مسلمان اور کیا دیگر قومیں اپنے خدا کی طرف رجوع کر رہی ہیں۔ یقیناً ایسی آفات آسمانی اور زمینی خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا کرتی ہیں تا کہ دنیا بی ن نوع انسان اس سے سبق حاصل کریں اور وحدہ لاشریک ہستی باری تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔

رضا تیری ہوجائے ہم کو نصیب تو کفضل اپنا اے موی کریم

اس ٹمن میں دنیا کے مختلف تجزیہ کار، سائنسدانوں اور ماہرین کی رائے اور تنیہ ہے کہ یہ نظرناک وائرس جنتی تبدیلیوں کے عام ہونے کا بہت رجحان ہے اور ایک نئے کرونا وائرس کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ایک ماہر کا خیال ہے کہ ہر تین سال بعد نئی بیماری وائرس آجائے گا اور دوسرے کا خیال ہے کہ کرونا وائرس پر قابو تو پایا جا سکتا ہے لیکن وباً امراض کے خلاف انسانیت کی جگہ نہ ختم ہونے والی جنگ ہے۔ انسانیت اور جرثیموں کے مابین ارتقا کی دوڑ میں کیڑے دوبارہ آگے آ رہے ہیں۔

ورلڈ ہیلتھ آرگانائزیشن کے مطابق 1970ء کے بعد سے اب تک 1500 سے زائد نئے وائرس دریافت ہوئے ہیں اور اکیسویں صدی میں وباً یہاں پہلے سے کئی گنا زیادہ تیزی سے دور تک پھیل رہی ہیں اور یہ عالمی سطح پر پھیل سکتی ہیں۔

علاوه ازیں سائنسدانوں کے جمع شدہ اعداد و شمار کے مطابق 1900ء سے لے کر 2016ء تک قدرتی آفات کے باعث عالمی معیشت کو 7 ٹریلیون ڈالر کا نقصان ہوا ہے اور ان کے ڈیٹا میں میں 35 ہزار قدرتی آفات کو شمار کیا گیا ہے جن کے نتیجے میں 80 لاکھ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ یہ اعداد و شمار یورپی جیوسائنس زیونین کے اجلاس میں پیش کئے گئے۔ ان قدرتی آفات میں سیلا ب، خشک سالی، زلزلے اور دیگر واقعات ہیں۔

مزید برائی ایک تحقیق کے مطابق گزشتہ 4 صدیوں میں کئی بار دنیا کی آبادی ان بیماری و باء سے متاثر ہوئی ہے۔ جن میں لاکھوں انسان لفہ اجل بن گئے اور کروڑوں متاثر ہوئے۔ آئینے ان چند صدیوں کا موازنہ کرتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

1 - 1720ء میں فرانس میں طاعون کی وباء شروع ہوئی جو افریقہ اور ایشیا میں بھی پھیل گئی۔ اس سے تقریباً ایک لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے اور یہ بیماری دوسری بار ہندوستان میں نمودار ہوئی 6 فروری 1898ء میں۔ اس میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے۔

2 - 1820ء میں ہندوستان کے شہر مکلت سے پھوٹنے والی ہیسٹے کی وباء نے پوری دنیا کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے۔

3 - 1918ء میں فلوسے 500 ملین افراد متاثر ہوئے جو دنیا کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ بتاتا ہے۔ اس وباء سے 50 ملین افراد ہلاک ہوئے۔ جس میں 6,75000 امریکی تھے۔ اس میں 15 سے 34 سال کی عمر کے افراد متاثر ہوئے۔ اس کو ہسپانوی فلو کہا گیا۔

4 - 1957ء میں ایشیائی فلوسنگا پور میں آیا۔ اس میں 11 لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور لاکھوں متاثر ہوئے۔

5 - 1968ء میں ہانگ کانگ کا گنگ فلو آیا۔ اس بیماری سے 10 لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور یہ ایشیا اور یورپ میں پھیل گیا اور یہ اور یہ اور یہ اس نام سے فوجی اسے اپنے ساتھ لے گئے جہاں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور ہزاروں متاثر ہوئے۔

6 - 1981ء میں ایڈز کی بیماری پھیلی بار امریکہ میں ظاہر ہوئی۔ دنیا میں اس سے متاثر ہونے والے افراد کی تعداد ساڑھے سات کروڑ ہے اور لاکھوں افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

7 - 2009ء میں سوانٹن فلو آیا اس کی نشاندہی میکسیکو میں ہوئی۔ اس بیماری سے 2 لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ یہ خنزیروں کو متاثر کرنے والا فلو وائرس تھا۔ اس فلو سے متاثر ہونے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔

علاوه ازیں پولیو وائرس سے بھی لاکھوں افراد متاثر ہوئے اور ہلاک بھی۔

یاد رہے قرآن میں سورۃ البقرہ میں مختلف کھانوں کی حلت و حرمت کا ذکر ہے۔ اس میں ایک نہایت اہم بات بیان ہوئی ہے جو کہ اسلام کو ہر دوسرے مذہب سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ کہ رزق محض حلال ہی نہیں طیب بھی ہونا چاہیے۔ بظاہر رزق اگر حلال بھی ہو تو بہتر بھی ہے کہ جب تک وہ انتہائی پاکیزہ اور صحت افزانہ ہو اس سے پرہیز کیا جائے۔ ان بیماریوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بتی نوع انسان نے قرآنی تعلیمات اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں کو منظہ نہیں رکھا۔ بھی وجہ ہے کہ روئے زمین پر وہ بھی آفات آ رہی ہیں۔ اس لئے کہ لوگ تقوی اختیار نہیں کرتے اور یہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں فتن و فحور پھیلائے ہیں۔ دنیا کو چاہیے کہ وہ اپنے خالق حقیقی اور امام وقت کی طرف رجوع کریں۔

وسعت اللہ خان کی خصوصی تحریر: سو سالہ شیخ مجیب

اور آج کا پاکستان

تحریر: وسعت اللہ خان

مجیب کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ جناح اور مجیب کی سیاسی زندگی میں کئی مماثلتیں ہیں۔ جیسے جناح شروع میں کٹر کانگریسی تھے، وہ ہندوستانی قوم پرستی پر لیسین رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان ہندوستانیت کی چھتری تلنے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دونوں الگ تو میں ہیں۔

شیخ مجیب کٹر مسلم لیگی، پارٹی کی طلباء تنظیم مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بیگال کے پروجوش رہنما تھے۔ سہروردی کی سرپرستی میں تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ مگر پاکستان بننے کے ایک سال کے اندر ہی انہیں محسوس ہونے لگا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی بیگال کی سوچ، سیاسی رجحانات، ثقافت اور سماجی ڈھانچے میں خاصا فرق ہے۔

آبادی میں کم ہونے کے باوجود فوج اور بیوروکری اور پالیسی سازی میں مغربی پاکستان بالا دست ہے لہذا نئے ملک کا وفاقی انتظام شاید بہت عرصے تک اس طرح سے نچل سکے یا تو یہ نظام تبدیل ہو گا یا پھر ٹوٹ جائے گا۔

پہلا دھپکہ بیگالی یا اردو کے قومی زبان بننے کے جھگڑے سے لگا۔ دوسرا دھپکہ ون یونٹ نے پہنچایا۔ بیگال نے چھپن فیصلہ کثریت کے باوجود وفاوت کی بقا کے لیے ون یونٹ کا فارمولہ قبول کر لیا۔ اُنیں سوچھپن کا پارلیمانی آئین بھی متفقہ طور پر بن گیا۔ حتیٰ کہ باقی ملک کی طرح مشرقی بیگال نے بھی پہلے مارشل لا کو قبول کر لیا۔ مارشل لا کے تحت نئے آئین کو بھی قبول کر لیا۔ بنیادی جمہوریت کے نظام کو بھی قبول کر لیا۔ اور اس کے تحت جنوری اُنیں سوپینیٹھ میں ہونے والے پہلے

اگر سکول میں پڑھائی جانے والی مطالعہ پاکستان کی کتاب پر یقین کر لیا جائے تو بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ بھی کوئی مشرقی بیگال پاکستان کا حصہ تھا جسے انڈیا نے ایک سازش کے تحت پاکستان سے علیحدہ کر دیا۔ یعنی آج کی سکول جانے والی نسل جتنا موہن جو دڑو کے بارے میں جانتی ہے، مشرقی بیگال کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتی۔ اس کے بعد آپ یہ موقع بھی کریں کہ وہ شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں تھوڑا بہت تو جانتی ہو گی تو یہ اس نسل کے ساتھ زیادتی ہے۔



ایسا کیوں ہے؟ دیکھیے اگر مشرقی بیگال یا مشرقی پاکستان کی علیحدگی یا بیگلہ دیش بننے کے اسباب کے بارے میں درسی کتابوں میں تفصیلًا پڑھایا جائے گا تو پھر شیخ مجیب کے ساتھ ساتھ تیکی خان، ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی بیگال میں فوجی ایکشن کا بھی تذکرہ کرنا پڑے گا۔

تذکرہ ہو گا تو بچے سوالات بھی پوچھیں گے۔ چنانچہ اس سے کہیں بہتر یہ نہیں کہ فرض کر لیا جائے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کوئی مشرقی پاکستان بھی تھا اور پھر اس نے اپنانام بیگلہ دیش رکھ لیا، قصہ ختم۔

آج کل کے سکولی نصاب میں صرف چار بیگالیوں کا تذکرہ ملتا ہے: اے کے فضل الحق جنھوں نے 1940 کی قرارداد لاہور پیش کی تھی، خواجہ ناظم الدین چونکہ وہ گورنر جنرل رہے تھے اور حسین شہید سہروردی اور محمد علی بوگرہ چونکہ وہ کچھ عرصے پاکستان کے وزیر اعظم رہے۔

سب سے زیادہ ذکر علامہ اقبال اور محمد علی جناح کا ہوتا ہے۔ جب میں نے شیخ



بیک مینگ کے ذریعے داؤ میں رکھنے کے رجحان سے کیسے نمٹا جائے۔ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے آج گورنمنٹ پاکستان جزل موئی اور وزراء سے ملاقات ہوئی۔ اس پر اتفاق کیا گیا کہ مرکز اور مغربی پاکستان کو انتظامی سختی کرنا پڑے گی اور اسمبلیوں اور میڈیا میں مشرقی پاکستان کی عدم وفاداری کو بے نقاب کرنا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ جب ان سے کہا جائے گا کہ وہ چاہیں تو پاکستان سے نکل سکتے ہیں، تو یہ سن کر ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔



بارہ اگست انیس سو ستر سو سی۔ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کی دوری اور ہندو زبان و ثقافت اپنانے کی کوشش کا سبب یہ ہے کہ ان کی نہ اپنی کوئی زبان ہے نہ ثقافت۔ اردو سے ان کا منہ مورٹن ظاہر کرتا کہ وہ برصغیر کی اجتماعی مسلمان ثقافت اپنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کی جانب سے دوسرے کاری زبانوں کا مسلط کیا جانا پاکستان کے لیے ایک الیہ ہے۔ چونکہ ان کے ہاں اسلامی فاسنے پر لٹریچر کی کمی ہے لہذا اقبال کی منتخب تحریروں کو بگالہ میں ترجمہ کر کے بڑے پیمانے پر تقسیم کیا جائے۔ مگر جب تک خود بگالی اسے فروغ نہیں دیں گے تب تک اس منصوبے کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔

ایکس اگست انیس سو ستر سو سی۔ مشرقی پاکستان پر مطہری انٹیلی جینس کی رپورٹ کے مطابق دیہی علاقوں کی پچانوے فیصد آبادی سچی مسلمان اور پاکستانی ہے۔ شہری علاقوں میں طبا، اساتذہ اور دانشوروں کی اکثریت نیپ، عوامی لیگ یا کیمونسٹروں کی حامی ہے لہذا انہیں پاکستان سے کوئی لگاؤ نہیں۔ عوامی لیگ ایک بگالی قوم پرست علیحدگی پسند جماعت ہے۔

سات ستمبر انیس سو ستر سو سی۔ خواجہ شہاب الدین (مرکزی وزیر) نے مشرقی پاکستان کے تفصیلی دورے کے بعد حالات سے آگاہ کیا۔ وہ آبادیدہ تھے۔ میں نے کہا کہ جو لوگ خود نہیں پہنچا رہے انہیں کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ میں نے خواجہ سے پوچھا کہ تم کیا مستقبل دیکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی ڈھا کہ کی جائیداد

صدر انتخابات میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

حزب اختلاف کی جس کمیٹی نے محترمہ فاطمہ جناح کو ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی انتخاب لڑنے پر بہت کوشش کر کے آمادہ کیا، یہ کمیٹی حسین شہید سہروردی کی کراچی کی رہائش گاہ لکھم ہاؤس میں تشکیل پائی تھی۔ اس کمیٹی میں شیخ مجیب الرحمن بھی شامل تھے۔ جن دو افراد نے فاطمہ جناح کے کاغذات نامزدگی جمع کروائے ان میں سے ایک صاحب کا نام شیخ مجیب الرحمن تھا۔ وہی مشرقی پاکستان میں فاطمہ جناح کی صدارتی مہم کے تنظیم بھی تھے۔ اگر آپ اس زمانے کی تصاویر دیکھیں تو ہر جلسے میں شیخ مجیب محترمہ کے آگے پیچھے نظر آئیں گے۔ بنگالیوں نے فاطمہ جناح کا بھرپور ساتھ دیا اور یہ بات ایوب خان سے ہضم نہ ہو سکی اور ایوب خان کی جیت بگال سے ہضم نہ ہو سکی۔

مگر اونٹ کی کمر پر آخری تکہ ستمبر انیس سو ستر سو سی کی جنگ تھی جو اس نظریے سے لڑی گئی کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کے مجاز پر کیا جائے گا۔ اس نظریے نے بطور ایک وفاتی یونٹ بنگال کے احساسِ تہائی کو مکمل کر دیا اور پھر اس کے رو عمل میں اگلے برس چھ نکات کا جنم ہوا۔ مغربی پاکستان کی حکمران قیادت نے ان نکات کو سنجیدگی سے لینے یا ان پر بات کرنے یا کوئی مصالحتی راہ نکالنے یا ٹھوں یقین دہانیاں کروانے کے بجائے اجنبیت کا راستہ اختیار کیا جس کے سبب خلیج بنگال بڑھتی چلی گئی۔

اس کا اندازہ آپ کو صدر ایوب خان کی ذاتی ڈائری پڑھ کے بخوبی ہو سکتا ہے۔ میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

چوبیس مئی انیس سو ستر سو سی۔ مارنگ نیوز کے بنگالی صحافی محسن علی نے مجھ سے ملاقات کی اور جاننا چاہا کہ میں مشرقی پاکستان کے حالات کو کس طرح دیکھتا ہوں؟ میں نے کہا کہ میں تو تمام ترقیاتی وسائل فراہم کر رہا ہوں مگر دوسری جانب سے صوبائیت اور علیحدگی پسندی کو ہوادے کر مغربی و مشرقی بازوں کو ایک دوسرے سے بدلنے کرنے اور مرکز کو بلیک میل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ وہاں جان بو جھ کر زبان اور ثقافت کو ہندو رنگ دیا جا رہا ہے۔ ٹیگور ان کا خدا بن چکا ہے۔ ہر شے پر بگالی رنگ ہے حتیٰ کہ گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں بھی بگالی میں ہیں۔ ایک مغربی پاکستانی خود کو ڈھا کہ میں اجنبی محسوس کرتا ہے۔ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر علیحدگی کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے شخص کو ہندو مت میں جذب کرنے کے خطرے کو نہیں بھانپ رہے۔

اٹھائیں جون انیس سو ستر سو سی۔ مشرقی پاکستان کی جانب سے مغربی پاکستان کو

تو کیا شوخی محبوب الرحمن بگہلہ دلیش بنانا چاہتے تھے؟ کیا وہ غدار اور بھارتی ایجنت تھے؟ عام پاکستانیوں کو پچیس مارچ انیس سوا کہتر کے بعد سے یہی گھٹی پلائی گئی۔ اس عرصے میں دونوں حصولوں کے مابین اطلاعات کی ترسیل کا نظام تھی حکومت کے کنٹرول میں تھا اور سیکریٹری اطلاعات رومنداخان تھے۔

شیخ محبوب کا نام انیس سواڑستھ میں اگر تله سازش کیس میں ڈال کر یہ تاشد دیا گیا کہ چھنکات دراصل انڈیا کے ساتھ مل کر ملک توڑنے کی سازش ہے۔ اس کیس کی سماut کے لیے ایک خصوصی ٹریبوئن بھی تشکیل دیا گیا۔ مُرجب نومبر انیس سو اٹسٹھ میں ایوب خان کے خلاف طلب اتفاقیک چلی اور اقتدار پر ایوب خان کی گرفت اتنی ڈھیلی ہو گئی کہ انہیں اعلان کرنا پڑا کہ وہ اگلے صدارتی انتخاب میں امیدوار نہیں ہوں گے، انہیں قومی سیاستدانوں کی گول میز کا نفرس طلب کرنا پڑی۔ اور مشرقی پاکستان کی قیادت کو اس کا نفرس میں شرکت پر آزاد کرنے کی قیمت پر اگر تله کیس والپس لے کر ٹریبوئن ختم کرنا پڑا۔ اس کے بعد شیخ محبوب کا سیاسی گراف مشرقی پاکستان میں چھٹ سے لگ گیا۔

ایوب خان کی معزولی سے پہلے تمام سیاستدانوں کا مطالبہ تھا کہ انیس سو چھپن کا آئین بحال کیا جائے۔ مگر یہی حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے کے بجائے باسٹھ کا آئین بھی ختم کر دیا اور لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کروانے کا اعلان کر کے نیا پینڈ و راباکس کھول دیا۔

لیگل فریم ورک آرڈر کی ابتدائی شق یہ تھی کہ صرف وہ سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لینے کی اہل ہیں جو نظریہ پاکستان اور پاکستان کی سالمیت پر کامل یقین

فروخت کر کے مغربی پاکستان منتقل ہونے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اگر حالات بہت بڑے ہو گئے تو ہم مشرقی پاکستان میں تحریک کاری کے خلاف لڑنے سے نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہم کروڑوں مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے بچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

تو یہ تھی ایوب خان کی سوچ۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایوب خان کا بنیادی پس منظر سیاسی نہیں عسکری تھا۔



کیا محمد علی جناح ہندوستان توڑنا چاہتے تھے؟ اگر ایسا تھا تو انہوں نے کہبٹ مشن پلان کیوں قبول کیا اور پھر میں انیس سو سینتالیس میں پارٹیشن سے تین مہینے پہلے تک کیوں کوشش کرتے رہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ جس پر چل کر مسلمان اپنے سیاسی حقوق کی ٹھوس آئینی خمانتوں کے سہارے متحده ہندوستان میں رہ سکیں۔ مگر نہ رہا اور پہلی نے پاکستان بنوادیا اور علیحدگی پسند و غدار جناح کو قرار دیا۔



درجن بھرا میدوار کھڑے کیے تھے مگر پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان میں ایک بھی نکٹ نہیں دیا۔ مگر آپریشن شروع ہونے کے چھ ماہ بعد ستمبر انہیں سوا کہتہ میں عوامی لیگ کے روپوش ارکانِ اسمبلی کی خالی نشستیں پُر کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کے ضلعی مارشل لا ایڈ منسٹریٹریز کے دفاتر میں سیٹوں کی بندربانٹ ہوئی تو اس میں پیپلز پارٹی نے بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ بلکہ پیپلز پارٹی کے رہنماء عبدالحفیظ پیرزادہ نے اس پر ناخوشی ظاہر کی کہ سیٹوں کی تقسیم میں مغربی پاکستان میں کامیابی کے تناوب کا خیال نہیں رکھا گیا۔

شیخ مجیب کو آپریشن کے بعد ڈھاکہ سے سایہوال جیل اور پھر لاہل پور منتقل کیا گیا جہاں انہیں لاہل پور ٹیکشاپ میل مل کے ایک کوارٹر اور اس سے متصل تھے خانے میں رکھا گیا۔ ان پر ملک دشمنی اور بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلانے کے لیے ایک خصوصی ٹرینیٹیل قائم کیا گیا۔

شیخ صاحب نے ٹرینیٹیل کا بائیکاٹ کیا۔ مگر ان کی جانب سے اے کے بروہی کوسکاری و مکمل مقرر کیا گیا۔

یہ ٹرینیٹیل کب ٹوٹا یا نہیں ٹوٹا، اس میں کیا کارروائی ہوئی، اس کا ریکارڈ کہاں ہے؟ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ بس اتنا ہوا کہ بیس دسمبر کو بھٹو صاحب نے اقتدار سنہالا اور دس جنوری انہیں سوبھتر کو ایک خصوصی پرواز سے شیخ مجیب الرحمن اور ڈاکٹر کمال حسین کو لندن روانہ کر دیا گیا جہاں سے وہ براستہ دلی ڈھاکہ پہنچ گئے۔

فروری انہیں سوچوہتر میں شیخ مجیب الرحمن کو لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے موقع پر اہل پاکستان نے آخری بار محب وطن یا غدار کے بجائے ایک آزاد ملک کے وزیر اعظم کے روپ میں بھٹو صاحب کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دیکھا۔ اس کے بعد سے باقی ماندہ پاکستان کی تاریخ میں سے مشرقی پاکستان یا بگلدلیش کا تذکرہ بھی کہیں غروب ہو گیا۔

(اس مضمون کی تیاری میں آئی اے رحمان، ڈاکٹر جعفر احمد اور زیر رحمان سے کی گئی گفتگو نے بنیادی مدد کی)



درجن بھرا میدوار کھڑے کیے تھے مگر پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان میں ایک اجازت ملی اور نتائج آنے کے بعد جب میکھی خان نے شاہ ایران سے شیخ مجیب کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے مستقبل کے وزیر اعظم ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بھلی بار محب وطن قیادت نے کسی ملک دشمن، غدار، غیر ملکی ایجنت کو وزیر اعظم بنانے کا فیصلہ کیا؟

شیخ مجیب کی سات مارچ انہیں سوا کہتہ تک جتنی بھی تقاریر ہیں، ان میں سے ہر تقریر میں یہ کہا جاتا تھا کہ ہم اپنی قسمت کے مالک خود بننا چاہتے ہیں۔ کسی بھی تقریر میں انتہائی دباؤ کے باوجود یہ جملہ نہیں ملتا کہ میں آج سے بغلہ دلیش کی آزادی کا اعلان کرتا ہوں۔

یہ اعلان تو آپریشن شروع ہونے کے بعد مسجدِ رحمان نے چٹا گانگ روڈیو سٹیشن پر قبضے کے بعد کیا۔

شیخ مجیب الرحمن کو پچیس مارچ انہیں سوا کہتہ کو آپریشن سرچ لائٹ شروع ہونے کے اگلے دن ڈاکٹر کمال حسین کے ہمراہ مغربی پاکستان منتقل کیا گیا۔ آپریشن سے ایک دن پہلے ذوالفقار علی بھٹو کراچی ایئر پورٹ پر اترے اور کہا ’خدا کا شکر ہے پاکستان فتح گیا‘،

بھٹو اور فوجی قیادت اور جماعتِ اسلامی وغیرہ تو چلیے ایک تیج پر تھے مگر مغربی پاکستان کے باقی رہنماء اور جماعتیں کیا کر رہے تھے؟

آپریشن سے پہلے اصغر خان، مولانا شاہ احمد نورانی، نیشنل عوامی پارٹی اور باعین بazio کی دیگر جماعتیں مجیب کو اقتدار منتقل کرنے کی حامی تھیں۔ لیکن فوجی آپریشن کے بعد تحریکِ استقلال کو چھوڑ کے لگ بھگ سب ہی قومی جماعتوں نے زبانی تشویش تو ظاہر کی مگر پھر معنی خیز کنارہ کشی اختیار کر لی۔ چین نواز کیمونسٹ بھی خاموش رہے۔

البتہ جام ساقی اور ان کے ساتھیوں نے آپریشن کے خلاف کراچی میں ایک چھوٹا سا جلوس نکالا اور دو چار گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ انفرادی سطح پر ملک غلام جیلانی (عاصمہ جہانگیر کے والد) لاہور کے مال روڈ پر فوجی آپریشن کے خلاف پلے کارڈ اٹھائے تھے کھڑے رہے۔

آئی اے رحمان، طاہر مظہر علی خان، وارث میر اور روز نامہ آزاد سمیت چند ہی نام بیس جو مخالفت کی انگلیوں پر گئے جاسکتے ہیں۔ باقی سب کو سانپ سونگھ گیا۔

حالانکہ انہیں سو ستر کے عام انتخابات میں عوامی لیگ نے تو مغربی پاکستان میں

بلوچ تاریخ کے آئینے میں

تحریر: میر ظہیر حسین بلیدی از تاریخ بلوچستان، بلوچ قبائل

ہمایوں ادھر سے گزرے تو اسے گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا جائے اور ساتھ ہی بے حد انعامات اور نوازوں کا وعدہ کیا گیا تھا۔

اتفاق دیکھیے... کہ ہمایوں... کسپری اور در بدربی کی حالت میں ایران سے امداد و تعاون کے حصول کی خاطر نوشکی (ڈاک) کے راستے علاقہ چاغی میں داخل ہوا اور سردار خطی خان کے دادا جہاں بیگ خان کے قلعہ کے سامنے خیمه زن ہوا اس کے ساتھ کچھ خدام بھی تھے۔

ہمایوں کے ایک منصبدار کی بیوی جو بلوچی زبان جانتی تھی قلعہ کے اندر داخل ہوئی اور ملک خطی خان کی بیگم ماہ ناز کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے پورا حال سنایا اور امداد و حفاظت کی درخواست کی۔

ملک خطی خان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہمایوں میرے قبضے میں ہے تو اپنے لوگوں سے مشورہ کیا کہ اگر ہمایوں کو کامران کے حوالہ کیا جائے تو انعام و اکرام بھی ملے گا اور اس کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی اور اگر ہمایوں کو جانے دیا جائے تو کامران کے ساتھ دشمنی اور غنیط و غصب سے واسطہ پڑے گا۔

مشاورت کے بعد ملک خطی خان اور اس کے ذی وقار ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک مظلوم، بے خانماں اور تخت سے محروم بادشاہ ہمایوں کو ہرگز گرفتار نہیں کریں گے اور کامران کا جہاں تک معاملہ ہے (ہرچہ بادا باد) جو کچھ ہوا بعد میں دیکھا جائیگا...

ملک خطی خان ایک عظیم بلوچ کی حیثیت سے ہمایوں کے خیمه میں ہمایوں سے ملاقاتی ہوا اور اسے تسلی دی کہ جمع خاطر کھیں آپ نے ہمارے ہاں پناہ لی ہے آپ ہمارے معزز مہمان ہے..... ہم بلوچ لوگ ہیں اور ہمیں اپنی روایات بے حد عزیز ہیں، اگرچہ ہمیں کامران کی طرف سے آپ کی گرفتاری کے احکامات مل چکے ہیں، مگر ہم سیم وزر کی لائچ میں آپ کے ساتھ بداخلیت کر کے اپنی شاندار روایات کو داغدار نہیں کریں گے... ہم کوئی ایسا اقدام نہیں اٹھائیں گے کہ ہماری آنے والی نسلیں ہماری وجہ سے شرمند ہوں... اور تاریخ میں ہم ہمیشہ کے لیے رسوایہ جائیں گے.... آپ بتا دیں ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟

روایت ہے کہ ملک خطی خان نے پچیس دن تک ہمایوں کو مہماں رکھا، اس کی

بلوچ نسل اُعری ہیں۔ لفظ بلوچ کو مختلف ادوار میں مختلف اقوام نے "بعل"، "بلوچ، بلوص، بلوش، بلوٹ، بیلوٹ، بیلوس اور بعلوس لکھا اور استعمال کیا ہے اہل بابل اپنے قومی دیوتا کو بال (بعل) عظیم کہا کرتے تھے یونانیوں نے اسے بیلوس کہا، عہد قدیم میں لفظ بلوچ کو بعلوٹ اور بیلوٹ لکھا جاتا تھا، اس کے بعد یہ لفظ بیلوس اور بعلوس کے طور پر تحریر و بیان میں آتا رہا، عرب اسے بروج، بلوص اور بلوش ادا کرتے ہیں اور ایرانی اسے بلوچ لکھتے اور بولتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایرانی لفظ بلوچ راجح ہے۔

اصل میں لفظ بلوص ہے جسے عربوں نے بلوش اور ایرانیوں نے بلوچ لکھا اہل ایران "ص" ادا نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے "ص" کو "چ" سے بدل کر اسے بلوچ کی صورت عطا کی اور عربوں نے "ص" کو "ش" سے بدل لی بلیدی قبلہ بیلوص کی شاہی اولاد ہے۔

ملک خطی خان سنجرانی بلوچ

سردار ملک خطی خان 1480ء کو چاغی کے علاقے میں سردار شاہ پسند خان کے ہاں پیدا ہوئے، وہ ابھی چھوٹے تھے کہ ان کا والد ایرانی حملہ آوروں کے ساتھ معرکہ میں شہید ہوئے، ایران کے طرف سے بزرگ زادہ بہمن کی سربراہی میں ایرانی لشکر نے محمد حسنی بلوچوں پر حملہ کر دیا، بلوچ ہونے کے ناطے سردار شاہ پسند خان نے بھی اپنے لوگوں کے ہمراہ ایرانیوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہادت کا مقام اپنایا۔

ملک خطی خان نے اپنے چچا جہاں خان کے ہاں جو اس وقت سیاہ دک میں مقیم تھا آغا نور محمد خاروئی سے تعلیم حاصل کی اور تقریباً 14 سال بعد واپس اپنے علاقے میں آ کر سرداری سنبھال لی اپنے منتشر قبیلہ کو متحدو منظم کیا۔

ملک خطی خان (اصل نام اطیف خان) کو سرداری سنبھالے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انہی دنوں بادشاہ ہند ہمایوں سے تخت چھین گیا اور وہ ملک اور پناہ کی خاطر سندھ و بلوچستان کے راستے چھپتے چھپاتے ایران کی طرف عازم سفر ہوا، اسی اشاء مرزا کامران جو اس وقت ہند کا بادشاہ تھا کی طرف سے ملک خطی خان حاکم چاغی کو خلعت و تحائف کے ساتھ ایک فرمان ملا، جس میں لکھا تھا کہ اگر

Instagram: @lahoreintl

Twitter : @lahoreintl

Facebook: lahoreinternational

YouTube: lahoreinternational

Google+: lahoreintl

Contact: +447940077825

Whatsapp: +447940077825

Email: lahoreintlondon@gmail.com

قارئین کے لئے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت مہنامہ لاہور اٹر نیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور نے قارئین کے لئے ایک نئی ویب سائٹ تشكیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالیٰ خبریں بھی ملاحظہ فرم سکتے ہیں۔ آپ کی تجویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے ”ادارہ“ پر عزم ہے۔ ویب سائٹ پر اردو اور انگریزی دونوں رسائل اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہذیب دل سے مشکور ہیں۔ دنیا نے صحافت میں آپ کی قدر دانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل تاثش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد ”ہفتہ وار“ کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاوں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاوں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور اٹر نیشنل)

تمام ضروریات پوری کیں اور اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے حافظ مامور کیے اور رخت سفر کے علاوہ بے شمار گھوڑے اور اونٹ بھی اس کے ساتھ کیے اور اپنی ذاتی حفاظت اور گنگانی میں ہمایوں کو ملک سیاہ یا سیاہ کوہ کے قریب سیستان میں دیوان چاہ کے مقام پر ناروئی، ریکی اور اسماعیل زئی بلوجوں کے جملہ سرداروں کو بلا کر مجلس کی ۰۰ اور ان سے امداد و حفاظت کا بلوجی قول لے کر ہمایوں کو ان کے سپرد کیا جنہوں نے کرمان کے راستے طہران تک اسے عزت و تکریم کے ساتھ پہنچایا۔

ایران سے واپسی پر ہمایوں نوکنڈی اور دالبندین کے راستے سے چاغی میں ملک خطی خان سے ملاقات کی اور ملک خطی خان نے درہ بولان کے راستے سی ۰۰ میں ہمایوں کو سردار چاکرخان رند (جو اس وقت بلوجستان کا بادشاہ تھا) کے حوالہ کیا، ۰۰۰۰۔

بالآخر میر چاکرخان رند کے بلوج فوج کی امداد و معاونت سے ہمایوں دوبارہ دہلی کا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۰۰۰ ہمایوں نے بلوجوں کے اس عظیم ملک بہادری اور مہربانی کے صلے میں بلوجوں کو دہلی کے نواح اور پنجاب کے مختلف مقامات پر بڑی بڑی جا گیریں عطا کیں اور اس طرح بلوجوں کی بڑی تعداد بلوجستان سے نکل کر ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں بھی آباد ہو گئے...۔

گویا ملک خطی خان نے ہمایوں کو پناہ اور اس کی امداد رہنمائی کر کے تاریخ میں نہ صرف اپنانام روشن کیا بلکہ پوری بلوج قوم کو بھی سرخرو و سرفراز کر دیا۔ ملک خطی خان کا اصل نام لطیف خان تھا چونکہ وہ ایک عالم شخص تھا اور بقول سردار ہاشم خان کے وہ نہایت خوش خط بھی تھا تو اس نسبت سے اس کا نام خطی خان مشہور ہوا۔

سردار خطی خان جب ضعیف ہو گئے اور اپنی زندگی میں اپنے بیٹے سرفراز خان کی دستار بندی کر کے قوم کا سردار بنایا۔

قریب نوے سال کے عمر میں سردار خطی خان اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔





چوڑا بازار لدھیانہ سے شاہین باغ دلی تک

تحریر: وجاہت مسعود

یتو جان لیں کہ بھارت میں ہوا کیا ہے۔

11 دسمبر 2019ء کو بھارتی پارلیمنٹ نے شہریت ترمیمی قانون منظور کر کے بگلہ دیش، پاکستان اور افغانستان سے غیر قانونی طور پر آنے والے افراد کو بھارتی شہریت کی اجازت دی لیکن اس قانون میں ہندو، سکھ، مسیحی، بدھ، جین اور پارسی مذاہب کا متعین ذکر کر کے مسلمانوں کو اس سہولت سے محروم کیا گیا۔ بھارت کے بیس کروڑ مسلمان شہریوں کے ساتھ مذہبی بنیاد پر یہ امتیازی سلوک محسن شماریاتی معاملہ نہیں۔ جنوبی ایشیا کے ان ممالک میں لاکھوں متفہم گھرانے آباد ہیں۔ آسام اور بہار میں ایسے ہی قوانین کے نتیجے میں ان گنت بھارتی مسلمان بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہو چکے ہیں۔ بھارت کے دستور کا آرٹیکل 14 تمام شہریوں کی مساوات کی ضمانت دیتا ہے۔

اپریل 1950ء کے لیاقت نہر و معاهدے کی رو سے دونوں ممالک مذہبی اقلیتوں کا تحفظ کرنے کے پابند ہیں۔

بھارت کے مسلمان کردہ ارض پر کسی بھی ملک میں سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں۔ یہ امتیازی قانون ایک طرف مسلمانوں کے مساوی شہری رتبے کی لفظی کرتا ہے، دوسری طرف مذہبی بنیاد پر قانون سازی کر کے دراصل بھارتی دستور کا سیکولر شخص تبدیل کیا جا رہا ہے۔ بھارتیہ جنپارٹی جمہوری طریقہ کار سے اقتدار میں آئی ہے لیکن مذہبی سیاست کے ذریعے جمہوری اقدار کو مستحکم کر رہی ہے۔ جمہوریت کسی ناقابل تغیر شناخت مثلاً مذہب یا نسل کے اکثریتی استبداد کا نام نہیں۔

بیجے پی نے جو آگ دہلی میں بھڑکائی ہے، یہ صرف بھارت کو سیاسی اور معاشی طور پر غیر مسکتم نہیں کرے گی، اس کے اثرات پورے جنوبی ایشیا پر مرتب ہوں گے۔ ریاست کی سرحدیں متعین ہوتی ہیں لیکن نا انصافی کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ جمہوری اقدار پر گروہی تعصباً کی آڑ میں بے رحم سرمائے کی بالادستی تسلیم کر لی گئی تو عالمی معیشت ناقابل تصور بحران سے دوچار ہو جائے گی۔ محلی منڈی کی معیشت اور سیاسی انصاف میں توازن قائم کرنے بغیر امن کی ضمانت نہیں دی جاسکت۔ کالم نگار پاکستان میں بیٹھ کے بھارت کو بھاشن دینے سے لطف نہیں اٹھا رہا۔

27 فروری کی صحیح سورج کی روپیلی کرنیں معمول کی طرح دریائے جمنا پر اتری تھیں۔ گلابی جاڑے کی سچی سکم دھوپ میں غیر ملکی صحفی دہلی کے جنوب میں جامعہ نگر پہنچ تو شاہین باغ کی رونق اجڑ چکی تھی۔ تین روز کی مار دھاڑ کے بعد غیر منصفانہ شہریت بل کے خلاف 75 روز سے جاری لاکھوں بھارتی شہریوں کا پرامن احتجاج تشدید کے جوار بھائے میں بے گیا تھا۔ مڑے تڑے جھنڈے اور نوچے ہوئے پوستر جہاں تھاں زمین پر بکھرے تھے۔ برج پوری کی فاروقیہ مسجد سے ابھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ عبادت گاہ کے گھن میں تازہ لہو کے نشان تھے، بلوائیوں کے پتھرا اور ڈنڈے فرش پر پڑے تھے اور مینار پر کسی نے ہنومان کی شبیہ کا زعفرانی جھنڈا گاڑ رکھا تھا۔ ویدوں میں ہنومان کو طافت کا دیوتا قرار دیا گیا ہے۔

مسجد کے مینار پر مگر یہ پھریرا انصاف دلانے والی شنقتی کی علامت نہیں، بھارتیہ جنپارٹی کے منہ زور ہنما کپل مشرکی دھونس کا نشان تھا جس نے گزشتہ ہفت احتجاج کرنے والوں کو انہتائی ناشائستہ لفظوں میں تشدید کی دھمکی دی تھی۔ فاروقیہ مسجد کا بزرگ موزن ان تین درجن شہریوں میں شامل تھا جو حکومت کی شہ، ریاست کی ملی بھگت اور نفرت کی سیاست کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

سینکڑوں دکانیں اور درجنوں مکان ملے کا ڈھیر بن چکے تھے۔ دلی کی غارت گری تو شاہ جہاں آبادی کی تاریخ میں گندھی ہے۔ میر صاحب نے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی افتادگی۔ غالب نے چاندنی چوک اور اردو بازار کا نوجہ لکھا۔ 1947ء کے آشوب کی تھا شاہد احمد بلوی کے حصے میں آئی۔

اکتوبر 1984ء میں اندر اگاندھی کے قتل کے بعد سکھ مخالف فسادات میں آٹھ ہزار مرنے والوں کو راجیو گاندھی نے ایک جملے میں منصادیا تھا، جب بڑا درخت گرتا ہے تو زمین کا نپتی ہے۔

ن م راشد نے کہا تھا، آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بے دیکھو۔ مگر نہیں، اجڑے شہروں کی گلیاں نسلوں تک دلوں میں ویرانی کے بگولے بودیتی ہیں۔ پچھتاوے گے، سنو ہو، یہستی اجڑے کے..... اس میں کچھ ذاتی واردات کا بیان بھی ہو گا لیکن پہلے

اسلام آباد سے چار ہزار سال، قدیم برتنوں کے ٹکڑے اور پتھر دریافت

تحریر: سحر بلوچ

بی بی سی اردو ڈاٹ کام، اسلام آباد
پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے علاقے سیکٹر 11-A میں ہونے والے
ایک حالیہ سروے کے دوران چار ہزار سال پرانے مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن
ملے ہیں۔

محققین اور ماہرین کی ایک ٹیم نے وہاں سے ملنے والے برتنوں اور قدیم
پتھروں کا جائزہ لینے کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ یہ برتن اور پتھر ہاکڑہ تہذیب سے
تعلق رکھتے ہیں۔

اس بارے میں بات کرتے ہوئے سینٹر فارکلچر اینڈ ڈیلپمنٹ سے منسلک
ماہر بشریات (اشٹھر پالوجست) ندیم عمر تارڑ نے بتایا کہ یہ ایک سطحی سروے
تھا اور یہاں سے ملنے والی اشیا کا تعلق قبل از تاریخ تہذیب سے متا ہے۔ اس
حوالے سے مزید معلومات حکومت کی طرف سے اس جگہ پر تفصیلی سروے کرنے
سے ملیں گی۔

ان برتنوں میں سے زیادہ تر بدھ مت دور کے ہیں۔ دریافت ہونے والی اشیا
میں چوڑیوں کے ٹکڑے بھی پائے گئے ہیں۔

لاہور سے تعلق رکھنے والے تاریخ دان زیر شفیع غوری نے بی بی سی کو بتایا کہ
اس طرح کے برتن پہلی مرتبہ جہاں دریافت ہوتے ہیں بعد میں ان کو اسی جگہ یا
تہذیب کا نام دے دیا جاتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ برتن چار ہزار سال پرانے
ہیں۔ اپنیکی برتوں کے ٹکڑوں کو قبل از تاریخ دور اور ہٹپ پر دور کے آخر سے جوڑا جا
سکتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ معلوم حاصل کرنے کے لیے محتاط رویہ اور صبر
سے کام لینا پڑے گا۔

سیکٹر 11-A میں دو پہاڑوں کے بیچ یہ زمین موجود ہے جس میں محققین کے
مطابق سینٹریوں چھوٹے چھوٹے پتھر اور برتوں کے ٹوٹے ہوئے حصے موجود
ہیں۔ جبکہ ایک طرف قبرستان بھی موجود ہیں جس میں کھدائی کے دوران مزید
برتن دریافت ہوئے ہیں۔

ہم نے اپنے ملک میں حادثات، غلطیوں اور جرائم کی طویل آزمائش سے گزر کر
یہ سبق سیکھا ہے کہ اپنے شہریوں سے نا انصافی کرنے والی ریاست جرائم پیشہ
گروہوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔

درویش نے گوجرانوالہ کے محلہ گوروناٹک پورہ میں آنکھ کھولی۔ تقسیم کی بے
گھری پر کئی برس گزر چکے تھے لیکن میرے بچپن پرستی کے مشرق میں آباد قبصہ
لدھیانہ کے چوڑے بازار کا سایہ پڑتا تھا۔ ہمارا گھر ان ایک سترہ سالہ بیٹے کی
قربانی دے کر پاکستان پہنچا تھا۔ میری دادی قیام پاکستان کے بعد 27 برس
حیات رہیں۔

سیاہ چادر اور ٹھیک تھیں اور صحن میں سوتی تھیں۔ انہیں گمان تھا کہ ان کا بیٹا، جسے
اس کے سکھ، ہم جماعتیں نے لدھیانہ گورنمنٹ کالج میں ہائیکیوں پر دھرلیا تھا، مارا
نہیں گیا، کہیں کھو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ رات گئے گھر پہنچے، دروازہ ھٹکھٹائے
اور دستک کا جواب نہ پا کر واپس لوٹ جائے۔ سودہ دروازے کے قریب سوتی
تھیں۔ دادی شام ڈھلے مجھے اپنے گھنٹوں پر بٹھا کر گھروں کو لوٹتے پرندوں سے
اپنے اس بیٹے کی باتیں کیا کرتی تھیں جس کا بے گور و گفن لا شہ برسوں پہلے مٹی میں
مل پکا تھا۔

اپنی ماں کا درد سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا بھر کی ماں کا دکھ بانٹا جائے،
ہر اس بآپ کا درد محسوس کیا جائے جس کی دکان نفرت کی سیاست میں جل جاتی
ہے، ہر اس بچے کے آنسو پوچھے جائیں جو نہیں جانتا کہ ریاست کی غنڈہ گردی
نے اسے شفقت کی چھاؤں سے محروم کر دیا ہے۔ مذہب کی آزادی ہر انسان کا
بنیادی حق ہے۔ ریاست شہریوں کی مذہبی آزادی کا تحفظ کرے تو مذہب چاندی
کرنوں کی طرح ٹھنڈک بکھیرتا ہے۔ ریاست جانبدار ہو جائے تو مذہبی تعصب
جلتے سورج کی تپش بن جاتا ہے جس میں شہری بے دست و پا ہو جاتے ہیں اور
تو میں برباد ہو جاتی ہے۔

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمائیں ادارتی نوٹ مضبوط کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف
کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو
اسی لئے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا
جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمائیں آن لائن ویب سائٹ اور
رسالے میں شائع شدہ معاوکا پی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع
کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا
کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔



مولوی، عورت مارچ اور کروناؤارس

تحریر عدنان خان کا گز

مارچ کی فاشی اور مولانا حضرات کی آہوں کے نتیجے میں کروناؤارس کا شکار ہو جائیں گی۔

پھر اس مرتبہ تو یہ معاملہ بھی ہے کہ ماڈرن سے ماڈرن خاتون بھی کرونا کے خوف سے منہ پر ماسک لپیٹے ہوگی۔ مولوی حضرات ان میں سے کسی کو نیک طبینت و قول صورت پائیں تو اس کو راہ راست پر لانے کے لئے گڑگڑگڑا کر دعا گو ہو سکتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر اس ڈسپوزبل ماسک کو مستقل نقاپ بنادے، رفتہ رفتہ نقاپ کا جاپ بنادے، جاپ کا برقع اور برفعے کاٹوپی والا افغانی برقع بنادے۔ اس گڑگڑا ہٹ کے دوران وہ بار بار خدا کو یاد کرتے ہوئے یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا

راہ کعبہ کی ملی ہے مجھے بت خانے سے

اگر سعودی عرب میں عمرے اور ایران میں زیارات پر کرونا کے خوف سے پابندی لگ سکتی ہے، اگر ایران میں جمیع کے اجتماعات کو کرونا کے حملے کے خوف سے منسون کیا جا سکتا ہے، تو پھر مولانا حضرات عورت مارچ کے اجتماع میں بھی یہی امید رکھیں کہ ادھر بھی ضرور کرونا کا حملہ ہو گا۔ یہی سوچ کر خود کو تسلی دے لیں کہ اس مرتبہ اس فسق و فجور پر ہماری بجائے کرونا نے حملہ کر دیا ہے۔



مقابلہ ڈاکو مینٹریز

لاہور انٹرنشنل کے یو ٹوب چیل کے لئے مختصر دورانیے کی ڈاکو مینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویدیو یو ٹوب بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے موقع پائیں۔ ان ڈاکو مینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشری،.....، ہو۔ ان ڈاکو مینٹریز کو یو ٹوب چیل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ مکملیکی معاملات کے ساتھ ساتھ تائج کا فیصلہ.....، اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکو مینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکو مینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کے علماء فضلا اس مرتبہ عورت مارچ کے خلاف مولوی مارچ کی تیاری کپڑر ہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق سکھر سے جنگ شروع ہو گی۔ عورت آزادی مارچ کی جوانٹ ایکشن کمیٹی نے اس برس سکھر سے مارچ شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ادھر سکھر میں جمیع علمائے اسلام نے عورت آزادی مارچ کی مخالفت کرتے ہوئے اسے آئین، قانون اور مشرقی روایات کے خلاف قرار دیتے ہوئے روکنے کا اعلان کیا ہے۔ مولانا راشد محمود سومرو نے تو یہ بھی بتایا ہے کہ

”میرا جسم میری مرضی“

جیسی مہم کے ذریعے ملک کو سیکولر ریاست بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

امیر جماعت اسلامی سراج الحق نے کہا ہے کہ ”میرا جسم میری مرضی“ کے نعرے ملک کی اسلامی شناخت پر دھبہ ہیں۔۔۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ہر ضلع میں بچیوں کے لیے یونیورسٹی بنے اور ان کے لیے کھیلوں کا با پردہ انتظام ہوتا کہ وہ بھی ڈاکٹر اور انجینئر بنیں۔“ کھیل ہی کھیل میں ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کے اس بہترین جماعتی منصوبے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ہماری مانیں تو مولانا حضرات اس عورت مارچ کو خدا کی رحمت سمجھیں۔ مولوی حضرات یہ بتا چکے ہیں کہ قوم پر کرونا کی صورت میں عذاب نازل ہوا ہے جس کا سبب فاشی ہے، اور وہ یہ بھی بتا چکے ہیں کہ عورت مارچ میں انہیں بھروسہ کی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کرونا و اس کا بھر پور حملہ عورت مارچ پر ہو گا۔ مولانا حضرات کو تو چاہیے کہ بڑھ چڑھ کر عورت مارچ کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں اور اس میں شرکت کرنے والیوں سے بھر پور تعادن کریں، ان کے کھانے کے لئے تنبوقاتیں لگائیں، ان کی راہ میں سیلیں لگوائیں، ان کے کھانے کے لئے پلاو اور یانی کی دیگیں پکوائیں۔ اور اس کے بعد مصلحت سنبھال لیں اور دعا کریں کہ کرونا مارچ کا رخ کرے مگر دیگیں پہنچانے والوں سے دور رہے۔

مہمانداری کی مہمانداری ہو جائے گی اور علماء کو یہ تسلی بھی ہو گی کہ ”میرا جسم میری مرضی“ کا نعرہ بلند کرنے والیوں میں سے سب سے زیادہ متحرک خواتین،



نریندر مودی، ختم نبوت اور جمہوریت

تحریر رفع عامر

ہے۔ پاکستان کی قومی آسٹبلی میں صوبوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے مطابق ہے۔ اس ایوان میں یہ امکان موجود ہے کہ اگر سب سے بڑے صوبے کی آبادی کل آبادی کا اکاؤن فیصلہ ہو جائے تو وہ چھوٹے صوبوں کے حقوق سلب کر لے۔

اکثریت کا یہ جبر رونکنے کے لئے ایوان بالا، یعنی پاکستان سینیٹ، میں تمام صوبوں کو مساوی نمائندگی دی جاتی ہے۔ اکثریت کے جبر کرو رونکنے کا ایک اور میکنیزم ایک ایسی عدالت کا وجود ہے جو مقتضہ اور انتظامیہ کے تابع نہ ہو اور جو آزادانہ مقتضہ کی قانون سازی کا تجزیہ کر سکے۔ عدالت کی آزادی یہی اس امر کی سب سے بڑی تصدیق ہے کہ اکثریت کی رائے ہی جمہوریت میں سب سے مقدس شے نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عدالت کو مقتضہ کی گلگانی پر نہ بٹھایا جاتا۔

جمہوریت میں اکثریت کی رائے سے بھی زیادہ مقدس چیزیں ہیں جن میں سرفہرست شہری حقوق ہیں۔ پاکستان سمیت جمہوری دنیا کے تمام آئینوں میں ایسی شقیں رکھی گئی ہیں جو مقتضہ کو پابند کرتی ہیں کہ وہ کوئی ایسی قانون سازی نہیں کرے گی جس سے شہریوں کے حقوق متاثر ہوتے ہوں یا حقوق میں امتیاز رکھا جائے۔ ایسی قانون سازی کے نتیجے میں عدالت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اسے منسوخ کر دے۔

یہ سب کہنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ جب نریندر مودی کی پارٹی نے شہریت کا نیا بل پاس کیا گیا تو بی جے پی کے دانشوروں کا ارشاد تھا کہ ایسا کرنے کی اجازت انہیں جمہوریت نے دے رکھی ہے۔ یہ حقیقت کے بالکل بر عکس ہے۔ یہ جمہوریت نہیں اکثریت کا جبرا ہے جو شہری حقوق میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ افسوس ہوا کہ بھارتی عدالت نے اس قانون سازی کو منسوخ نہیں کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت میں بھی پاکستان کی طرح جمہوری نظام تو موجود ہے لیکن جمہوری عمل میں بہت سے سقم ہیں۔

اُدھر پاکستانی حلقوں میں بھی اس قانون کی واضح مذمت کی گئی اور اسے بجا

اڑکپن کے دور میں میں جناب غلام احمد پرویز کی فکر سے بہت متاثر ہوا کرتا تھا۔ ہر جمعے کی صحیح بلا نامہ گلبرگ لاہور میں طلوعِ اسلام کے دفتر جا کر ان کا ویڈیو لیکھر سننے جایا کرتا تھا۔ پرویز صاحب کا بنیادی موضوع ویسے تفسیر قران تھا لیکن وہ وسیع المطالعہ شخصیت تھے اور دنیا میں مروجہ نظریات پر بھی اکثر رائے دیا کرتے تھے۔

جمہوریت کے بارے میں وہ فرمایا کرتے تھے کہ جمہوری نظام میں اگر اکاؤن فیصلہ لوگ غلط بات کو صحیح قرار دے دیں تو وہ ملک کا قانون بن جائے گا۔ بات دل کو گلتی تھی۔ اقبال کے بندوں کو گناہ کرتے ہیں تو انہیں کرتے کی گواہی نے جمہوریت کے اس سقلم پر مہر تصدق ثبت کر دی۔

آگے چل کر جب جان لاک، ایڈمنڈ برک اور دوسرے مصنفوں کو پڑھا جھیں جدید تصور جمہوریت کا بانی سمجھا جا سکتا ہے تو اداک ہوا کہ جمہوریت میں قانون سازی خلا میں نہیں کی جاتی اور جمہوریت اور اکثریت کے جبر میں فرق ہوتا ہے۔ پاکستانی دوستوں سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ کئی لوگوں کو اس فرق کا پوری طرح علم نہیں۔

جمہوری مفکرین نے جب جدید جمہوریت کے خدوخال متعین کیے تو انہیں واضح طور یا احساس تھا کہ جمہوریت میں اکثریت کے جبر کا امکان موجود ہے۔ ایڈمنڈ برک نے تو صاف لکھا کہ جمہوری نظام میں یہ ممکن ہے کہ اکثریت اقلیت کو اس کے حقوق سے محروم کر دے۔ امریکی آئین کے مصنفوں تو اکثریت کے جبر سے اس قدر خائف تھے کہ انہوں نے اپنی نئی مملکت کو ایک ڈیموکریٹی کہنے کی بجائے ایک ریپبلیک قرار دیا۔

بدستی سے اردو زبان میں عمومی طور پر ان دونوں الفاظ کا ترجمہ جمہوریت ہے لیکن تصوراتی طور پر یہ دو مختلف چیزیں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آج کے جمہوری ممالک بیشمول پاکستان دراصل ریپبلیکس ہیں۔

جدید جمہوریت کے اس تصور میں اکثریت کے جبر سے بچاؤ کے لئے کچھ میکنیزم پہنچاں ہیں۔ سب سے آسان مثال ایوان ہائے نمائندگان کی ساخت

امریکی عدالیہ ایک دن میں اس قرارداد کو کوڑے کے ڈھیر پر بچینک دے گی کیونکہ ریاست کا تعلق شہریوں کے حقوق و فرائض سے ہوتا ہے، ان کے عقائد سے نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عوام کی اکثریت ایسے مسائل میں جذباتی ہوا کرتی ہے جو کہ درست بھی ہے اور انہیں اس کا حق بھی ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ریاست عوام کے جذبات کو منظر کھکھ کر پچھے اقدام کر دے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ یہاں مجھے اختلاف ہے۔

ریاست کبھی بھی نہ جذباتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی جذبات کا احترام کرنا اس کا کام ہے۔ ریاست کا کام اکثریت کے جذبات پر اقدام کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس اقلیت کو اکثریت کے جذبات سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس میں پاکستانی اور بھارتی ریاستیں، دونوں ناکام ہوئیں۔ یہ جمہوریت نہیں، اکثریت کا جر ہے جس میں دو بھیڑیوں اور ایک بھیڑ میں وٹنگ کروائی جاتی ہے کہ رات کے کھانے میں کیا ہو گا۔

طور پر جمہوریت کی روح سے روگردانی کہا گیا۔ ہم بھارت کے تناظر میں تو جمہوریت اور اکثریت کے جرم میں فرق جان چکے ہیں لیکن شاید خود احتسابی سے کتراتے ہوئے اپنی تاریخ پر زنگاہ ڈالنے سے گریزاں ہیں۔

پاکستان میں کمی دفعہ اکثریت اپنی رائے بالجھر نافذ کر چکی ہے جس کی سب سے بڑی مثال 1974 میں پاکستانی پارلیمان کا احمدی پاکستانیوں کو غیر مسلم قرار دینا تھا۔ غیر مسلم صرف یہیں بلکہ اس کی زد میں احمدیوں کے شہری حقوق آئنے ہیں۔ یہ وہ سیر ہی تھی جس پر چڑھ کر بعد میں جزل ضیا الحق نے اتناع قادریانیت آرڈیننس پاس کیا جس کے تحت احمدیوں پر وہ پابندیاں لگائی گئیں جو دنیا کے کسی بھی پیمانے پر بنیادی انسانی اور شہری حقوق کی خلاف ورزی ہیں۔

میں بخوبی جانتا ہوں کہ پاکستان میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت احمدیوں کو غیر مسلم سمجھتی ہے اور انہیں یہ رائے رکھنے کا حق ہے۔ اگر کبھی کسی نے ان کا یہ حق چھیننے کی کوشش کی تو جمہوریت پسند ایسے اقدام کی بھی مخالفت کریں گے۔ جیسے کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے کو غیر مسلم سمجھے اور قرار دے، اسی طرح آرائیں ایسے کے بنیاد پر ستون کو بھی یہ رائے رکھنے کا حق حاصل ہے کہ بھارتی ہونا ہندو ہونے سے مشروط ہے۔ لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اکثریت رکھنے کی بنیاد پر اپنی رائے ریاست پر مسلط کر دے۔ یہ جمہوریت نہیں، اکثریت کا جر ہے۔

دنیا میں احمدیوں سے مماثلت رکھنے والی ایک اور جماعت بھی ہے جس کی بنا امریکہ میں رکھی گئی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عمومی طور پر مورمنز کہا جاتا ہے۔ یہ یسوع مسیح کے علاوہ اٹھارہ سو پانچ میں پیدا ہونے والے جوزف سمتوخ کو اپنا نبی مانتے ہیں اور اسی پر بس نہیں۔ یہ اس کے بعد آنے والے ہر جماعتی سربراہ کو بھی نبی مانتے ہیں۔

اس کے باوجود کہ ان کے نظریات میسیحیت سے خاصے مختلف ہیں، یہ لوگ خود کو مسیحی ہی کہتے ہیں۔ بہت سے مسیحی رہنماؤں کے مطابق ان لوگوں کے پاس خود کو مسیحی کہنے کا حق نہیں لیکن امریکی ایوان نمائندگان کا کوئی رکن سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ کبھی پارلیمان میں یہ مل پیش کرے کہ مورمنز کو غیر مسیحی قرار دیا جائے۔ بفرض محال کوئی ایسی قرارداد پیش کر بھی دے اور کسی معجزے کے نتیجے میں امریکی پارلیمان اس قرارداد کو منظور بھی کر لے تو

اشتہارات کے لیے

رسالہ مہنماہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطلع کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کرو اکر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشویہ، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل YouTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسائلے میں موجود ہیں شکریہ

<http://www.youtube.com/channel/>

UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

کرونا اور ہماری معاشرتی اقدار

تحریر: محمد فتح ملک

کیا ہم مخالفت اور شمنی میں اتنا آگے چلے گئے ہیں کہ رسول خدا کے عملی رویے کو بھول گئے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ کیا تھا سب بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مشرکوں پر بد دعا کیجئے تو نبی رحمت نے فرمایا: میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں۔ میں تورحمت بننا کر بھیجا گیا ہوں۔

مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی و شمنوں پر جب قحط کا عذاب آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ کیا تھا؟ کیا آپ نے ان کے مرنے کی دعا کی؟ نہیں بلکہ جب ابوسفیان، بحالت کفر چند روز سائے قریش کو ساتھ لے کر آپؐ کے آستانہ رحمت پر حاضر ہوا اور گڑگڑا کر کہنے لگا کہ اے محمد! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تمہاری قوم بر باد ہو گئی، خدا سے دعا کرو کہ یہ قحط کا عذاب مل جائے۔ آپؐ لوگوں کی بے قراری اور گریہ وزاری پر رحم آ گیا۔ چنانچہ آپؐ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے فوراً ہی آپ کی دعا مقبول ہوئی اور اس قدر زوردار بارش ہوئی کہ سارے عرب سیراب ہو گیا اور اہل مکہ کو قحط کے عذاب سے نجات ملی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف تشریف لے گئے تو انہوں نے آپؐ سے جو برا سلوک کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کو لوہا ہان کر دیا ایسی حالت میں پہاڑوں کے فرشتے نے آپؐ سے عرض کی: اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ان دونوں پہاڑوں کو ان کافروں پر گردوں تو میں گردوں گا۔ یعنی کہ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ایسا نہ کرو بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ پاک ان کی نسلوں سے اپنے ایسے بندوں کو پیدا فرمائے گا جو اللہ پاک کی عبادت کریں گے۔

یہ چند مثالیں ہیں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے وشمنوں سے سلوک کی۔ اس کے مقابلے پر ہماری قوم اپنے ہی ہم وطنوں کے لئے کیا دامنگ رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ جب کرونا کی ابتداء ہوئی تو سوشن میڈیا پر بے شمار ایسی پوسٹس آئیں کہ یہ عذاب حرام چیزیں کھانے کی وجہ سے آیا۔ باوجود اس کہ تاحال اس وائرس کی ابتداء کا علم نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے مقابلے ہمارے ملک کے "مسلمان"، منافع خوروں، دھوکے بازوں اور انسانوں کے خلاف بد دعائیں کرنے والوں کے بارے میں ہم سب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ دراصل یہ ہماری مجموعی جہالت اور ہماری عدم رواداری کی تصویر ہے۔ کیا یہ ہماری اقدار ہیں؟ کیا یہ ہماری معاشرتی تصویر ہے؟ کیا یہ ہماری ذمہ داری ہے؟ کیا یہ ہمارا دین ہمیں سیکھاتا ہے؟ سوچنے کی ضرورت ہے۔

دنیا میں مختلف ممالک نے اس کی روک تھام کے لئے اقدامات شروع کر دئے ہیں۔ یورپ کی "کافر" کمپنیوں نے Sanitizers بنانے کی مقدار میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے مفت تقسیم کرنے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ لیکن پاکستان میں جو کچھ ہورتا ہے وہ سن کر شرم سے سر جھک جاتا ہے کہ مسلمان کھلانے والے کیا کر رہے ہیں۔ منافع خور ماسک اور سینیٹا نزر کی قیتوں میں کئی سو گنا اضافہ کر رہی ہیں۔ ابھی تو اس وبا کا علاج دریافت نہیں ہوا اور نہ اس کی دوا حاصل کرنے کے لئے نہیں کتنے ہی پاپڑ بیلنے پڑتے۔

اس وبا کی مرض کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کعبہ شریف میں طواف بھی روک دیا گیا۔ عرب ممالک میں مساجد سے آذان میں اس اعلان کی ویڈیو سوشن میڈیا پر واڑل ہو چکی ہے جس میں لوگوں کو گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ نیز بعض عرب ممالک میں جمعہ پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ دوسری طرف اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نامنہاد عالم دین کی ویڈیو ہے جو فرماتے ہیں کہ ان کے مذہبی جلسہ میں شامل ہوں اس میں شامل ہونے سے کسی کو اس وباء کا اثر نہیں ہوگا۔ اگر وبا کا اثر ہوا تو وہ ذمہ دار ہیں۔ ایک طرف ان جاہل علماء کے دعوے ہیں جس میں وہ وباء کے باوجود لوگوں کو جلسہ میں شریک ہونے پر زور دے رہے ہیں اور دوسری طرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ وباء کے علاقہ میں نہ جاؤ۔ حدیث کی مستند تریب کتاب میں یہ حدیث درج ہے کہ "جب بھی کسی علاقے میں طاعون پھیلنے کی خبر سن تو وہاں مت جاؤ، اور اگر جس علاقے میں تم موجود ہو وہاں پر طاعون پھوٹ پڑے تو وہاں سے ڈر کر باہر مت بھاگو۔"

اب وقت ہے کہ پاکستان کے عوام سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں کہ کس کی بات مانیں؟ یہ سب کچھ تو اس بات کے سامنے ہیئت نہیں رکھتا جواب بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وہ دراصل ہماری اجتماعی سوچ کی غماضی کرتا بیان ہے۔ سوشن میڈیا کی سائٹ ٹویٹر پر ایک صارف نے ٹویٹ کی کہ

"یا اللہ پاک سب قادیانیوں کو کرونا وائرس میں بٹلا فرم۔ آمین ثم آمین"

اس ٹویٹ کے نیچوں گئے جواب میں آمین اور قادیانیوں کو گالیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ ہماری اخلاقی اور معاشرتی حالت۔ ایک وبا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب بن کر نازل ہوئی ہے اس سے بچنے کے لئے بجائے تو بہ کرنے اور عملی اقدامات کرنے کے ہم مختلف عقیدہ رکھنے والے انسانوں کے اس میں بٹلا ہونے کے لئے دعا عینیں کر رہے ہیں۔ یہ ایک ٹویٹ نہیں بلکہ ہزاروں انسانوں کی آواز تھی۔ اگر ہزاروں کی آواز نہیں تھی تو کم از کم ایک "دنی مجاہد" کی آرزو ضرور تھی۔





تحریر: ڈاکٹر طاہرہ کاظمی

پنجابی، پنجابی بولنے سے کیوں شرماتے ہیں



پہلے گھر کے اہل خانہ میں ایک مشہور شاعرہ بھی تھیں جو اپنا لکھا ہوا مرثیہ دوسرا گھر دہلی والا کھلاتا۔

ہماری اماں شرکت کی انہائی شوقین، صح صبح گھر کا کام نبٹا تیں اور ہمیں لے کر روانہ ہو جاتیں۔ مرکزی کمرہ اور برآمدے فرنچس سے خالی ہوتے اور چاند نیاں بچھی ہوتیں۔ سوزخوانوں کے لئے مرکزی کمرے میں ایک تخت کے سامنے مائک لگا ہوتا اور ارد گرد پہلے آئیے کی بنیاد پر خواتین پیٹھتیں۔ جب مرکزی کمرہ بھر جاتا، پھر برآمدے کی باری آتی۔

خواتین کا لے کپڑوں میں ملبوس ہوتیں۔ غرارے، ساڑھیاں، کھڑے پاجامے اور چوڑی دار سب دیکھنے کو ملتے۔ چونکہ یہ سب لباس پنجابی خاندانوں میں نہیں پہنچاتے تھے سو میرے لئے یہ سب بہت پرکشش ہوتا۔

اس سب ترتیب میں سب سے تکلیف دہ بات یہ ہوتی کہ پنجابی حیلے والی خواتین کو مرکزی کمرے میں بیٹھنے سے بہانے بہانے سے منع کیا جاتا۔ اور کوشش یہ کی جاتی کہ پنجابی یا اردو دانوں کے نزدیک پینڈو نظر آنے والی خواتین کو باہر برآمدے میں بٹھایا جائے اور سب غرарوں اور ساڑھیوں کو مرکزی کمرے میں جگہ دئی جائے جہاں مجلس کے ساتھ ساتھ پانداں کا دور بھی چلتا۔

ہم چوں کہ شروع سے محفل باز تھا اس لئے جب ہماری اماں برآمدے میں نکل جاتیں، ہم ان کا برقع کھینچتے، امی اندر چلیں نا نہیں بیٹھا! یہیں ٹھیک ہے۔

”کیوں امی! اندر ابھی بہت جگہ ہے۔“

”نہیں بیٹھا! دیکھو یہاں سے مجلس کے بعد نکانا آسان ہو گا، اندر بہت رش ہو جائے گا۔“

اماں جو رویے بھانپنے میں بہت تمیز تھیں اور بہت انا پسند بھی، کبھی اندر جا کے نہیں بیٹھیں۔ کبھی کبھی جب ہم بہت ضد کرتے، ہماری امی ہمیں اندر بٹھا

اماں! آپ ہم سے پنجابی کیوں نہیں بولتیں۔ آپ نے ہمیں سکھائی بھی نہیں میری امریکہ میں جرنلزم پڑھنے والی، فرفرا نگریزی بولنے اور لکھنے والی بیٹی، سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔

”آپ کو کیسے خیال آیا بیٹا؟“

”اماں! وہ خالو عرفان ملک ہیں نا، پنجابی کے شاعر اور آپ کی دوست کے میاں۔ میں جب بھی ان کے گھر جاتی ہوں وہ مجھ سے پنجابی میں بات کرتے ہیں۔ اور مجھے نانی ماں کی یاد آتی ہے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ پنجابی میں بات کرتی تھیں نا۔“

اس سوال نے دماغ کے بہت سے نہایا دریچوں کو واکر دیا، ماضی میں جھانکنا عذاب ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ یہ کھڑکی خود بخود کھل جاتی ہے۔

”ہمیں پنجابی کبھی اچھے نہیں لگے، بہت اونچا بولتے ہیں، اردو بولتے ہوئے لہجہ انہائی گنوار ہوتا ہے، چاہے جتنا بھی پڑھ لکھ جائیں۔“

ہماری کراچی سے تعلق رکھنے والی اردو دان دوست کہہ رہی تھیں۔

”میں بھی تو پنجابی ہوں۔“

”ہاں مگر لگتی نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”آپ کا لہجہ بہت صاف ہے اور تلفظ بہت اچھا۔“

میرے بچپن کی یادوں میں کچھ یادیں بہت اثر انگیز ہیں۔ ہمارے شہر میں محرم بہت اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ مرد حضرات شام کو امام بارگاہ جاتے اور خواتین صحیح کو مختلف مجالس میں، جن کا اہتمام کئی گھرانے ہر محرم میں کرتے تھے۔ گویا یہ ان کی مخصوص مجالس تھیں۔ سب سے اہم تین گھر تھے۔ پہلی مجلس صحیح نوبجے ہوتی۔ دوسری بارہ بجے اور تیسرا تین بجے۔ خواتین ایک کے بعد دوسرے اور پھر تیسرا گھر کو روانہ ہوتیں۔ اتفاق سے تینوں گھر دہلی اور لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے اہل زبان تھے۔

گھر والوں سے بات کرتیں اور کسی کے کسی انداز میں کوئی شرم ساری نہ کے خود باہر آ جاتیں۔ اس کی ہمیں تب سمجھ تو نہیں آئی مگر الاشبور نے اس کو محفوظ کر لیا اور بہت بعد میں سمجھ آیا کہ اردو دن خواتین، جو اپنی تعلیم اور اپنے رکھ رکھا تو والی ثقافت پہ بہت نازل تھیں، اپنے رویے سے مقامی پنجابی عورتوں کو کم تر ثابت کرنے میں کامیاب رہی تھیں۔ لکھنؤی تہذیب آباد تو پنجاب میں ہو گئی تھی مگر احساس برتری کا شکار ہو کے مقامی لوگوں میں رپنے بننے کی وجہ سے ان کو کم تر گردانتی رہی۔ اور ان کے رویے واضح طور پر تفحیک آمیز ہوتے۔

وقت آگے بڑھا۔ میاں صاحب اور بچوں کے ساتھ ہم اردو ہی بولتے۔ بچوں کو ہم نے پنجابی کا پینڈولہجہ سیکھنے ہی نہیں دیا۔ اور سب بہن بھائی اور کمزوز یہی کر رہے تھے۔ اگرچہ جب خود احتسابی کا دورہ پڑتا، صاحب اکثر اپنی حیرت کا اظہار کرتے کہتے ”جب کبھی پٹھان جرنیل یونٹ کا دورہ کرنے آتے ہیں، اور اگر کسی پٹھان کو دیکھ لیں چاہے وہ سپاہی ہی کیوں نہ ہو، عہدے اور امتیاز کی پروا کیے بغیر اس سے پشتہ میں حال چال دریافت کرتے ہیں اور یہی حال باقی سب صوبوں سے تعلق رکھنے والوں کا ہے۔ سوائے ہمارے پنجابی بھائیوں کے جو آپ سے کبھی بھی پنجابی نہیں بولیں گے اور پنجابی ہونے کی آشنائی کا اظہار بھی نہیں کریں گے۔“

سعودی عرب پہنچ، بہت بڑا اسپتال، اور پاکستان کے سب صوبوں سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹروں کی صورت احوال۔ اب تک ہمیں پنجابی پینڈولہجہ کے تصور سے چڑھو چکی تھی۔ ہماری ایک دوست پہلے سے وہاں کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ سب پنڈی لاہور والے، پنجابی بولنے سے کتراتے ہیں اور اگر کوئی یہ غلطی کرے تو اس کے بیک گراونڈ پر ہنسا جاتا ہے۔ اور اردو اسپیلنگ اس کو بڑھاوا دینے میں پیش پیش۔ یہ سن کر ہم نے کچھ ٹھان لی۔ ہمارے اعزاز میں سب پاکستانیوں کی طرف سے خوش آمدید کی دعوت کی گئی۔

ہم دعوت میں گئے اور خوب ٹھانٹھ سے گئے۔ دوسروں تک ہماری شہرت سینیر ڈاکٹر ہونے کی پہنچ چکی تھی۔ مادرن حلیہ، ڈگریوں کی لست اور ہمارا دھڑلے سے سب سے پنجابی میں بات کرنا۔ بہت سی خواتین کے برج اس دن الٹ گئے۔ ہم دوسال وہاں رہے اور ہر دعوت میں پنجابیوں سے علی لاعلان پنجابی بولی، اہل زبان سے اردو، انگریزوں سے انگریزی اور عربوں سے عربی۔ بعض دفعہ ہم پھرتی سے چاروں زبانوں کو موقعے کی مناسبت سے استعمال کرتے اور ہمیں اپنے لوگوں کے چہروں پر صاف حیرت نظر آتی۔



بڑے ہوئے، ہوٹل پہنچ، پاکستان کے ہر صوبے سے بھانت بھانت کی لڑکیاں۔ گھروں سے تعلق نہ سے ہوتا، یا پھر ہوٹل کا اکلوتا فون جو کامن روم میں تھا اور سب کے گھروں والے اس پر بات کرتے۔ ویک اینڈ پر خوب رش ہوتا اور ہر کسی کی بات ہر کوئی سنتا۔ ہم حسب عادت اردو میں بات کرتے اور سب پنجابی لڑکیاں بھی ڈھیلے ڈھالے پنجابی لمحے میں اردو میں بات کرتیں۔

ہم وہ پہلی نسل تھے جنہوں نے پنجابی کا دامن جھٹک کے اردو میں پناہ لی تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہماری نسل کے ماں باپ جو زیادہ تعلیم یا فتنہ نہیں تھے، نے اپنی اولاد کی آنکھوں میں اعلیٰ تعلیم کے سپنے سجائے تھے اور اولاد اپنی زبان اور کلچر کے متعلق کم تری کا شکار ہو گئی تھی جس کے ذمہ دار ٹھٹھا اڑانے والے اردو دان تھے۔

ہمارے لئے انہائی اچنہبے کی بات تب ہوتی جب پٹھان، سندھی، بلوچ اور گلگتی لڑکیاں دھڑلے سے اوپنجی آواز میں اپنی مادری زبان میں اپنے



حاجی رچرڈ برٹن

تحریر: رووف پارکیہ



اس کے تلفظ کی غلطی دراصل اس کے بھان ہونے کی بنا پر ہے۔

رچرڈ برٹن کا حج کے لئے جزیرہ نما عرب جانا خطرات اور مشکلات سے خالی نہیں تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تو ڈاکوں کے ہاتھوں لٹنے اور قتل ہونے کا تھا۔ گو رچرڈ برٹن اسلامی رسوم، عبادات، روایات اور طریقوں کا گہرا علم رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود یہ خطرہ موجود تھا کہ کہیں اس کی شناخت نہ ہو جائے اور حج تو دور کی بات مخفی مکہ اور مدینہ میں داخل ہونے کی بنا پر ہی اس کو قتل نہ کر دیا جائے۔ رچرڈ برٹن کہتا ہے کہ مقامی حکمران ان مقدس شہروں میں آنے والے ایسے بن بلائے مہماں کو سزا موت نہیں دیتے تھے لیکن اگر کوئی غیر مسلم عوام کے ہاتھ لگ جاتا تو اس کی موت یقینی ہوتی تھی۔

رچرڈ برٹن نے اپنے سفر حج کا احوال۔ مکہ اور مدینہ کے سفر کا بیان۔ کے عنوان سے تین جلدیوں میں لکھا تھا۔ اگرچہ رچرڈ برٹن حج ادا کرنے والا پہلا غیر مسلم نہیں تھا لیکن وہ ان معنوں کے ضرور شامل تھا جو بھیں بدلت کر حج ادا کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ رچرڈ برٹن کے اس سفر نامے کو مولوی انشا اللہ ایڈیٹر وطن لاہور نے سفر دیار المصطفیٰ کے عنوان سے 1910ء میں لاہور سے شائع کیا تھا۔

رچرڈ برٹن 1821ء میں پیدا ہوا۔ ہندوستان اور عرب کے علاوہ اس نے جنوبی اور شمالی امریکہ کا سفر کیا۔ وہ صومالی لینڈ گیا اور نیل دریا کا مأخذ تلاش کیا۔ رچرڈ برٹن دوبارہ 1876ء میں ہندوستان آیا اور اپنے قیام کے دوران وہ سندھ، گوا اور کچھ دیگر علاقوں میں گیا۔ اس کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ اس نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن وہ خود کو لامدہ ہب کہتا تھا۔

برٹن نے چالیس کے قریب کتابیں اور متعدد مضامین لکھے تھے۔ یہ سب انٹر نیٹ پر موجود ہیں۔ برٹن کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جنھیں کیٹلاگ نہیں کیا گیا اور بہت سی تو ابھی تک شائع بھی نہیں ہو سکی ہیں۔

اکتوبر 1890ء میں برٹن کی موت کے بعد اس کی بیوی نے اس کے بہت سے مسودے اور دیگر کاغذات نذر آتش کر دیئے تھے حتیٰ کہ اس کی ڈائری جو وہ چالیس سال لکھتا رہا تھا بھی آگ سے نہیں نجک پائی تھی۔

سر رچرڈ فرانس برٹن غیر معمولی صلاحیت اور بے مثل قابلیت کا حامل شخص تھا۔ شاذ ہی کوئی دوسرا ایسا شخص ہو گا جس نے علمی میدان میں اس قدر متعدد کام کیا ہو جتنا کہ رچرڈ برٹن نے کیا تھا۔ اس نے ایک سے زائد علمی شعبوں میں کارہائے نمایاں سر انجام دیئے، بہت سی زبانوں پر دسترس حاصل کی اور متعدد موضوعات پر ایسی کتابیں لکھیں جو آج بھی اہل علم سے داد و تحسین وصول کرتی ہیں۔

آئرلینڈ سے تعلق رکھنے والا ایسٹ انڈیا کمپنی کا آرمی آفیسر رچرڈ برٹن افسانہ نگار، شاعر، مترجم، نقشه نگار، کھوجی، ماہر نسلیات، سپاہی، سفارت کار، منتشر، صوفی، خفیہ ایجنت، ماہر لسانیات اور جغرافیہ دان تھا۔ اس کے لکھے سفر ناموں کو علم و ادب کا خزینہ سمجھا جاتا ہے۔

رچرڈ برٹن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کاما سوترا کو اس نے دریافت کیا تھا اور الف لیلوی کہانیوں سے اہل مغرب کو اسی نے متعارف کرایا تھا لیکن علمی دنیا میں اس کی بڑی وجہہ سفر نامے ہیں جو اس نے دنیا کے متعدد ممالک، خطوط اور برا عظموں کے اسفار کے بعد لکھے تھے۔ مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے بارے اس کے علم سے دنیا ب تک مرعوب ہے۔

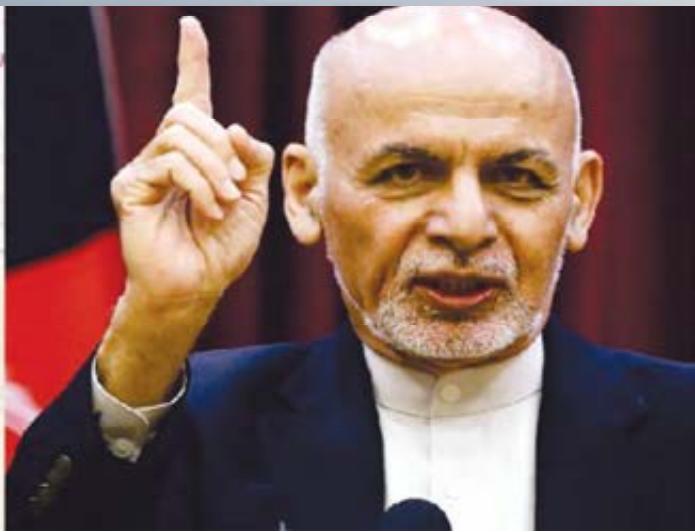
رچرڈ برٹن 1842ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ یہاں قیام کے دوران اس نے مسلمانوں کے طرز زندگی، عقائد اور رسومات کا عین مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان میں قیام کے دوران اس نے جو مقامی زبانیں سیکھیں ان میں اردو، ہندی، سنکریت، گجراتی، پشتو، بلوچی، هنگام، تیلگو، پنجابی، هرائیکی، مرائی، فارسی، عربی اور کچھ دیگر زبانیں شامل تھیں۔ اس نے سرائیکی زبان کی گرامر بھی لکھی تھی۔ برٹن ایک سے زائد یورپی زبانیں بھی جانتا تھا۔

رچرڈ برٹن 1849-1853 کے درمیان واپس انگلستان پہنچ کر اس نے مختلف ہندوستانی زبانوں اور اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی کتابیں شائع کیں۔ 1853ء میں رچرڈ برٹن بھیں بدلت کر حج ادا کرنے کے معظمه جا پہنچا۔ قیام مکہ کے دوران کوئی اسے نہ پہچان سکا۔ حج سے واپسی پر اس نے اپنے سفر کا احوال لکھا کر شائع کر دیا۔

رچرڈ برٹن نے حج کا یہ سفر سندھ سے چند مسلمانوں کے ہمراہ کیا تھا۔ وہ مختلف طریقوں سے اپنے ہمراہیوں کو بتاتا رہا کہ وہ مسلمان ہے۔ جب اس کے ساتھیوں کو اس کے تلفظ کی بنا پر شک ہوا تو اس نے یہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا کہ

امریکہ طالبان معاہدہ افغانستان میں امن کی ضمانت نہیں دیتا

تحریر: سید مجاهد علی



افغان حکومت طالبان کے پانچ ہزار کے لگ بھگ قیدی رہا کرے گی جبکہ اس کے بدالے میں طالبان اپنی قید میں افغان سیکورٹی فورسز کے ایک ہزار افراد رہا کر دیں گے۔ افغان صدر اشرف غنی اب اسی بنیادی اور اہم نکتہ سے انحراف کرتے ہوئے اعلان کر رہے ہیں کہ امریکہ کو افغان حکومت کی طرف سے ایسا کوئی وعدہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ طالبان قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ میں ایسا

الافغان مذاکرات میں ہی کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ صدر اشرف غنی کا یہ نکتہ قبل غور ہے کہ کوئی تیسرا ملک کس حیثیت میں ایک خود مختار اور آزاد حکومت کی طرف سے کسی رعایت کا وعدہ کر سکتا ہے۔ البتہ افغانستان کے معاملہ میں امریکہ کوئی عام ساتیسرا ملک نہیں ہے بلکہ 18 سال سے افغانستان میں مصروف جنگ ایک طاقت ہے۔ امریکی فوجی طاقت ہی کی وجہ سے اس وقت کابل میں اپنی حکومت قائم کرنے ہوئے ہیں اور خود کو افغان عوام کا نمائیندہ کہلاتے ہیں۔ یہ قیاس کرنا دشوار ہے کہ امریکہ نے طالبان کے نمائیدوں کے ساتھ معاہدہ میں یہ شرط شامل کرتے ہوئے اس پہلو پر غور نہیں کیا ہو گا یا صدر اشرف غنی اور ان کے نمائیدوں کو اس نکتہ سے آگاہ نہیں کیا گیا ہو گا۔

اشرف غنی کو یہ اعتراض اس وقت کرنا چاہئے تھا جب امریکہ افغان حکومت کی شمولیت کے بغیر طالبان کے ساتھ معاہدہ کے لئے مذاکرات کرتے ہوئے اس کی تفصیلات طے کر رہا تھا۔ یعنی ممکن ہے کہ امریکہ صدر اشرف غنی کا بازو مرور کر اور انہیں دباؤ میں لا کر طالبان کے ساتھ ہونے والے معاہدے پر عمل کرنے پر بجور کر دے تاہم ایسا اسی وقت ممکن ہو گا اگر امریکہ واقعی افغانستان میں امن کا خواہاں ہے اور اس کا بنیادی مقصد وہاں سے اپنی افواج کے انخلاتک محدود نہیں ہے۔

ایسے کئی اشارے ابھی سے سامنے آ رہے ہیں کہ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے جو

لغوی معنوں میں ابھی امریکہ اور افغان طالبان کے درمیان معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی اور اس 'متاریجی' معاہدے پر تحسین و توصیف کے ڈونگرے ابھی برسائے ہی جا رہے تھے کہ افغانستان کے صدر نے معاہدہ کے ایک اہم نکتہ سے انحراف کرتے ہوئے طالبان کے پانچ ہزار قیدیوں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ صرف اس ایک اعلان سے افغانستان میں امن کے امکانات اور اس میں حائل مشکلات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک سال تک جاری رہنے والے مذاکرات کے بعد ہفتہ کے روز طالبان وفد کے قائد ملا عبدالغنی برادر اور امریکی مذاکراتی ٹیم کے سربراہ زلمی خلیل زادہ نے دو حصہ کی ایک شاندار تقریب میں ایک امن معاہدے پر دستخط کئے تھے جس کے تحت امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان سے 14 ماہ میں بذریعہ اپنی افواج واپس بلا لیں گے جبکہ طالبان اس بات کو تین بناۓ گے کہ افغان سرزی میں کسی ایسے گروہ، تنظیم یا فرد کو استعمال کرنے کی اجازت نہ دی جائے جس سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو خطرہ لاحق ہو۔ اس کے ساتھ ہی 10 مارچ سے بین الافغان مذاکرات شروع کرنے اور افغانستان کے نظام حکومت کے بارے میں لاچھے عمل طے کرنے کا کام شروع کیا جائے گا۔

امریکہ نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ اگر طالبان امن قائم رکھنے اور اپنے وعدوں پر عمل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں تو امریکہ آئندہ 135 دنوں میں پانچ ہزار کے لگ بھگ فوجی واپس بلا لے گا۔ وہاں پس میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے امید ظاہر کی ہے کہ اگر حالات خوشگوار رہے تو پانچ ہزار امریکی فوجیوں کو میں کے آخر تک وطن واپس بلا لیا جائے گا۔ باہمی اعتماد سازی اور میں الافغان مذاکرات کو کامیاب بنانے کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ

نماہندوں کو سرکاری یا غیر سرکاری حیثیت میں مذاکرات کا حصہ بنالیا جائے۔ طالبان نے معاهدہ میں بین الافغان مذاکرات پر اتفاق کیا ہے لیکن افغان حکومت کے ساتھ مذاکرات کا عندیہ نہیں دیا۔ امریکہ کے ساتھ غیر ملکی افواج کے انخلاء کا معاهدہ کرتے ہوئے بھی انہوں نے یہ اہتمام کیا کہ افغان حکومت کو فریق تسلیم نہ کیا جائے۔ افغان گروہوں کے درمیان مذاکرات میں افغان حکومت کی پوزیشن بدستور غیر واضح اور اس کا سیاسی مستقبل غیر یقینی ہے۔ اس پس منظر میں بھی صدر اشرف غنی کی پریشانی اور بدوہی قابل فہم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح طالبان نے اس تمام مدت میں اس بات پر اصرار کیا ہے کہ وہ افغانستان کے موجودہ آئین اور انتظام کو نہیں مانتے۔ وہ ملک میں اسلامی شرعی نظام نافذ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ امریکہ نے صرف یہ کامیابی حاصل کی ہے کہ اس سوال کو معاهدہ کا حصہ بنانے کی بجائے اسے افغان گروہوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔

امریکہ، فوجیں واپس بلانے کا معاهدہ کرنے کی جلدی میں طالبان کو ان بنیادی اصولوں پر بھی آمادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا جو گزشتہ اٹھارہ برس کی جنگ جوئی کی بنیاد کہے جاتے رہے ہیں۔ کہ افغانستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا، موجودہ آئین کو تسلیم کیا جائے گا، مساوی حقوق اور خاص طور سے خواتین کے حقوق کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے گا۔ امریکہ اور طالبان کے درمیان ہونے والا معاهدہ ان میں سے کسی بات کی ضمانت فراہم نہیں کرتا۔ اس لئے اگر اس پر پوری طرح عمل درآمد ہوتا ہے اور ممکنہ اور متفقہ بین الافغان مذاکرات میں نئے سیاسی انتظام پر اتفاق رائے ہو جاتا ہے تو امریکہ اس نئے انتظام میں انسانی حقوق یا معاشرے میں خواتین کی مساوی حیثیت کے بارے میں کوئی ضمانت حاصل نہیں کر سکے گا۔ امریکہ نے معاهدہ میں صرف ایک شرط رکھی ہے کہ طالبان افغانستان کو امریکہ دشمن عناصر کا مسکن نہیں بننے دیں گے۔ اس مقصد کے لئے دو دہائی سے امریکہ سے برسر جنگ گروہ کو ہی عملی طاقت تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اس بات کا امکان نہیں ہے کہ طالبان مستقبل قریب میں ہونے والی بات چیت میں اپنے اصولوں سے مخرف ہو جائیں گے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ کی طرف سے ایسے بہانے بنانے کی کوشش کی جائے جس کی وجہ طالبان اس امن معاهدہ کو خود ہی ماننے سے انکار کر دیں۔ اس حوالے سے یہ نوٹ کرنا بھی اہم ہے کہ امریکہ طالبان معاهدے میں کمل جنگ بندی کی کوئی شق موجود نہیں ہے البتہ طالبان کو غیر ملکی فوجوں پر حملہ نہ کرنے کا پابند کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں امریکہ، افغانستان سے اپنی فوجیں نکال کر اس بدنصیب خطے کو ایک بار پھر باہم دست و گریبان عسکری گروہوں کے رحم و کرم پر چھوڑ نے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔



اپنی ہی بات سے مکرنے اور پل بھر میں رائے تبدیل کرنے میں یہ طولی رکھتے ہیں، عجلت میں اس معاهدہ کو مکمل کرنے پر محض اس لئے زور دیا ہو کہ وہ اس کی بنیاد پر امریکی عوام کو یقین دلا سکتیں کہ انہوں نے سابق انتخابات میں کئے گئے سب وعدے پورے کئے ہیں۔ شام میں داعش کی مکمل شکست اور ابو بکر بغدادی کی ہلاکت کے بعد اب طالبان کے ساتھ معاهدہ، صدر ٹرمپ کے لئے اہم انتخابی نظرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج وہاں ہاؤس میں میدیا سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے یہ واضح کیا کہ اب امریکی فوجیوں کے طلن واپس آنے کا وقت آگیا ہے۔ ٹرمپ کے اقتدار میں رہتے اس بات کا اندیشہ موجود ہے گا کہ ان کی حکومت کسی بھی لمحے طالبان پر الزامات عائد کرتے ہوئے معاهدہ پر پوری طرح عمل کرنے سے انکار کر دے یا انتخابی مہم کے دوران سیاسی نظرے بازی کے لئے افغانستان سے واپس بلائے گئے فوجیوں کو دوبارہ وہاں تعینات کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں طالبان کے ساتھ مذاکرات اور افغانستان میں امن قائم کرنے کی خواہش اور وعدے محض سراب ثابت ہوں گے۔

ان شبہات میں اضافہ کی سب سے بڑی وجہ تو معاهدہ کی تقریب کے بعد امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ، نیٹو کے جزل سیکرٹری یونس ستوتلن برگ اور امریکی وزیر دفاع مارک ایسپر کے بیانات ہیں۔ ان سب نے تو اتر سے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ اگر طالبان نے معاهدہ کی خلاف ورزی کی یا اس کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری نہ کی تو امریکہ بھی اس پر عمل کا پابند نہیں ہو گا اور افغانستان میں جنگ جاری رکھی جائے گی۔ جیزت ہے کہ جس معاهدہ کا آغاز ڈھمکیوں اور یک طرفہ اخراج سے ہو رہا ہو، اس کی کامیابی کے بارے میں کتنے یقین سے امید قائم کی جا سکتی ہے۔

افغان طالبان اس معاهدہ کو امریکہ پر اپنی کامیابی کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ ایک لحاظ سے ان کا یہ دعویٰ درست ہے۔ امریکہ نے 2001 میں افغانستان پر حملہ کر کے طالبان کی حکومت ختم کی تھی لیکن اٹھارہ سال کی جنگ کے دوران وہ طالبان کی قوت کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس دوران طالبان نے عسکری اور سیاسی طور پر خود کو ایک طاقت کے طور پر منوایا ہے۔ امریکہ جس گروہ کو دہشت گرد قرار دے کر ان کے خاتمے کا عزم کئے ہوئے تھا اب ایک معاهدہ کے ذریعے انہی طالبان سے یہ امید کی جاری ہے کہ وہ افغان سر زمین کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف سرگرمیوں سے پاک رکھنے میں معاونت کریں گے۔ طالبان کا شروع سے موقوف رہا ہے کہ وہ کابل پر نافذ کی گئی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ امریکہ کے ساتھ 'حملہ آور فوج' کے طور پر بات چیت کریں گے تاکہ غیر ملکی فوجوں کو افغانستان سے نکالا جاسکے۔ اس معاهدہ کے تحت طالبان اپنے اس اصولی موقوف میں کامیاب رہے ہیں۔ جبکہ امریکہ اس سارے عمل میں طالبان کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا کہ افغان حکومت کے

کیا دفاتر میں خوش مذاق کرنا ٹھیک ہے؟

تحریر: نیل میکینزی بی بی سی نامہ نگار

نوکری چھوڑتے وقت انہوں نے کمپنی کی ایج آرٹیم کو بتایا کہ دفتر میں ہونے والے نازیب المذاق کی وجہ سے انہوں نے خود اپنی جان لینے کی بھی کوشش کی تھی۔

تو ہیں آمیز باتیں:

کیٹ کا تجربہ غیر معمولی تھا۔ تاہم متعدد دیگر خواتین بھی کیٹ کی اس بات سے متفق ہیں کہ کام پر ہونے والے غیر مناسب مذاق کے دوران بعض اوقات حد پار ہو جاتی ہے۔ برطانیہ میں ہونے والے ایک سروے میں بیس ہزار افراد سے بات کی گئی جن میں سے صرف 16 فیصد خواتین نے کہا کہ انھیں کام کی جگہ ہونے والے نازیب المذاق سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد 28 فیصد برطانوی مرد حضرات کو لوگتا ہے کہ کام پر خوش مذاق کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ برطانوی مرد دنیا کے کئی ممالک جیسا کہ ترکی، میکسیکو، کینیڈا، آسٹریلیا اور امریکہ کے مردوں سے زیادہ نازیب المذاق کرنے میں خوش محسوس کرتے ہیں۔



کیٹ (فرضی نام) کو اپنے کریئر کے آغاز پر نہیں پتا تھا کہ دفتر میں کیسا ماحول ہو گا۔ اب وہ ایک کامیاب ایگزیکٹیو کے طور پر کام کر رہی ہیں اور اب انھیں لگتا ہے کہ اس وقت آگے بڑھنے کے لیے وہ کسی بھی چیز کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھیں۔

گر کرم از کم انھیں کریئر کے آغاز پر دفتر میں جنسی حوالوں سے غیر مناسب طمع ملنے کی امید بالکل نہیں تھی۔

جب کبھی وہ سرخ ہیل والا سینڈل پہن کر کام پر جاتی تھیں تو ان کے ایک باس از راہ مذاق کہا کرتے تھے کہ انہوں (کیٹ) نے زیر جامہ نہیں پہن رکھا، وہ ایسے متعدد واقعات کی مثال دیتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اگر کسی مینگ میں وہ کپیوٹر کا پلک لگانے کے لیے نیچ جھکتی تھیں تو ان کے ساتھ کام کرنے والے سینہر مرد افراد کہتے تھے کہ اب جبکہ آپ نیچ ہیں، جب تک انہوں نے وہ نوکری نہیں چھوڑی وہ سمجھ چکی تھیں کہ لاں ہیل والی سینڈل پہننے پر ہونے والے عام مذاق کا کیا مطلب تھا۔

کیٹ کو مذاق کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن وہ کہتی ہیں کہ بات کے مناسب ہونے اور نہ ہونے میں ایک دھندلی سی لاں ہوتی ہے۔ لاں کی دوسری طرف بات نکل جائے تو وہ مناسب نہیں رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر شہروں کی سخت زندگی میں یہ سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق کے دوران جب آپ موضوع مذاق بن جائیں تو یہ مذاق نہیں جنسی ہراسانی کے زمرے میں آتا ہے۔



ہیومن ریٹنیشن وارچ میں سینیئر محقق ہلری مار گلوس نے بتایا کہ اگر آپ کام پر نازیب المذاق کرنے کے بجائے اسے کام ختم کر کے دوستوں کے ساتھ شراب خانے میں کرنے کے لیے بچا کر رکھیں تو اس سے ساتھ کام کرنے والی خواتین پر بہت فرق پڑتا ہے۔

بیشتر خواتین کو لوگتا ہے کہ اگر انہوں نے ایسے مذاق کو ہنسی میں نہیں اڑایا تو لوگ انھیں غیر ضروری طور پر سنجیدہ سمجھیں گے۔ مار گلوس کے مطابق ایسا کرنے سے

قبولیت حاصل ہے ان ممالک میں بھلپتیم اور چین سرفہرست ہیں جہاں 47 فیصد مرداں طرح کے مذاق بے تکفی سے کرتے ہیں۔
میکسیکو، کینیڈا اور امریکہ میں ایسے 13 فیصد مرد، ہی ملے۔

جہاں تک اس بارے میں کھل کر بولنے کی بات ہے تو برطانوی خواتین اس میں پیچھے نہیں ہیں۔ 80 فیصد خواتین نے کہا کہ نازیما مذاق کرنے والے دوستوں یا رشتہداروں سے وہ کہتی ہیں کہ وہ غلط کر رہے ہیں۔ برطانوی مردوں نے بھی کہا کہ ضرورت پڑنے پر وہ خواتین کے ساتھ ہیں۔ وہ جنسی ہراسانی کے خلاف لڑائی میں ان کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔



ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "لہنامہ لاہور انٹر نیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آگینی" لاہور رسالہ ہرزوں اردو اور انگریزی میں انداز سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی رسالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قدر میں کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشروں کی بہتر اصلاح، سچی کھربی صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بڑیں میں یا اشتبہرات کی ضرورت ہوتی ہے جو تمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجز نہ درخواست ہے کہ اس کی ہاتھ مالی مدد فرمائے اس کا دخیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپ کی معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہو گی۔ آپ اپنی رقم درج تذیل بیک میں جمع کرو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا خاتم و ناصر ہو۔

Bank Name:

Lloyds Bank PLC

Account Name:

Lahore International LTD

Account No:

42534160

Sort Code:

30-96-26



خواتین یا دوسراے ایسے افراد جو مذاق میں نشانے پر ہوں، مثال کے طور پر ایں جی بی ٹی افراد، اپنی بے عزتی محسوس کر سکتے ہیں۔ جس سے متعلق مذاق مردوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن سکتا ہے، خاص طور پر جب کام کی جگہ پر اکثریت خواتین کی ہو۔

اثرات کو姆 سمجھا جاتا ہے:

مارگلوس نے بتایا کہ بسا اوقات مذاق کا مطلب صرف مذاق ہی ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی لوگوں کو لگتا ہے کہ خواتین کا مذاق اڑانے والے مذاق کر کے اپنی مردانگی کا انہصار کر رہے ہیں۔ یہ بات خواتین کو پریشان کر سکتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ کئی بار ایسے ماحول میں خواتین بالکل خاموش ہو جاتی ہیں، انھیں لگتا ہے کہ کسی کو نہیں پتا چلنا چاہیے کہ وہ اصل میں کیسی ہیں۔

مارگلوس کا خیال ہے کہ کام کی جگہ پر ایسے مذاق پر کئی بار خواتین اس لیے بھی ہنسنی ہیں تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ بہت جذباتی ہیں، حساس ہیں یا یہ کہ انھیں مذاق سمجھا ہی نہیں آیا۔

اپنے اصل سے دور بھاگنے اور لوگوں کی توقعات کے مطابق برداشت کرنے سے وہ کام میں بھی پچھے ہو سکتی ہیں۔ مارگلوس کا خیال ہے کہ کئی بار ایسے ماحول کے سنبھلہ اثرات کوム سمجھا جاتا ہے۔

عدم برداشت:

کیٹ کو یہ تجربہ برسوں پہلے پیش آیا تھا۔ فناس کی دنیا میں کام کرنے والوں کے سو شل نیٹ ورک پلیٹ فارم مسٹی ہائیو کی بانی یوسٹا نے بتایا کہ وہ ایسے کسی شخص کو نہیں جانتی ہیں جو آج کل کے ماحول میں نازیما مذاق کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ اس طرح کے مذاق کے لیے اب عالمی مقامات پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اسی طرح نسل پرستانہ مذاق کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ اب اس طرح کے مذاق کرنے والے کے بارے میں فوری طور پر کمپنیوں کو غور کرنا چاہیے۔ خاص طور پر "می ٹو" مہم کے بعد۔ ایسے مذاق کو کسی بھی صورت قبول نہیں کیا جانا چاہیے۔

بات کرنا ضروری:

سنگر کالج اور اپسوس موری کی جانب سے کیے گئے مشترکہ سروے میں 27 ممالک کے لوگوں سے اس بارے میں بات کی گئی۔

ایسے ممالک جہاں کام پر جس سے متعلق مذاق کرنے کو سب سے زیادہ

انسان نے کیسے اور کیوں بولنا سیکھا؟

بشنکر یہ بی بی سی نیوز

کا کہنا ہے کہ ہم میں سے بہت سے صحبت ہیں کہ یہ بات پانچ لاکھ سال پہلے تک جا سکتی ہے۔

ایک ہی جد

پروفیسر فولی کا کہنا ہے کہ آج کی دنیا میں ہزاروں زبانوں کا ایک خزینہ ہونے کے باوجود اس بات کا بہت تو قیامکان موجود ہے کہ آج کے دور کی ہماری تمام زبانوں کا منع ایک ہی ہو یا ایک ہی جد سے شروع ہوئی ہوں۔

اس کی تاریخ کا تعین کرنا کسی حد تک انسانی ارتقا کی حیاتیات کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ جنیات سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم سب افریقہ میں ایک چھوٹی سی آبادی سے نکلے ہیں۔ گوکہ ہماری نسل کے باہر بھی کئی زبانیں ہو سکتی ہے لیکن جو زبانیں آج ہم دیکھتے ہیں ان کا مأخذ غالباً ایک ہی زبان ہو جس میں جدتیں اور تبدیلیاں ہوتی رہی ہوں۔

آثار قدیمہ کے شواہد

ہمارے اجداد کی ہڈیوں سے ہمیں بہت کم ایسے اثرات ملتے ہیں جن سے یہ تعین کیا جاسکے کہ ہم نے کب بولنا شروع کیا۔

پروفیسر فولی کا کہنا ہے کہ گویا ای دراصل تنفس یا سانس لینے کا عمل ہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف سانس لینے کا عمل ہی ہے لیکن کامل کنٹرول کے ساتھ کہ جس سے مختلف آوازیں پیدا ہو سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں اپنے جسم کے پھوٹوں پر، بہت زیادہ کنٹرول ہو اور ہماراً ای افرام ہمارے نزدیک ترین بولنے سکنے والے جاندار بن مانس سے زیادہ بہتر ہو اور اس میں زیادہ اعصاب ہوں۔

ان سب اعصاب کا مطلب ہے کہ ہماری ریڑھ کی ہڈی بن مانسوں سے زیادہ موٹی ہو اور ان سے زیادہ چوڑی ہو۔ اگر آپ اپنے معدوم ہونے والے بھائیوں نیند رہال، جو چھ لاکھ سال پہلے تک موجود تھے ان پر غور کریں تو ان میں یہ تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

لیکن اگر آپ دس لاکھ سال پہلے چلے جائیں تو اس وقت پائے جانے والے ہو موایرکٹس جو قدیم انسانوں سے پہلے کی انسان نما مخلوق تھی ان میں یہ تبدیلیاں وقوع پذیر نہیں ہوئی تھیں۔

یہ میں ایک ابتدائی خاک فراہم کرتے ہے کہ کب انسانوں نے بولنا شروع کیا۔

جنیات کا بھی اس میں دل ہے

ہڈیوں اور انسانی ڈھانچوں کے ریکارڈ کے علاوہ جنیات کے علم میں اضافے سے زبانوں کی تاریخ کا تعین کرنے میں بھی کافی مدد رہی ہے۔

پروفیسر فولی کا کہنا ہے کہ ایک جیں جس کا نام ایف او ایکس پی ٹوجیں ہے وہ تمام قدیم جانداروں میں یکساں پائی جاتی تھی۔ لیکن انسانوں میں اس کی ایک تبدیل شدہ شکل موجود تھی۔

جنگلوں میں رہنے والے ہمارے آباء اجداد نے کیوں اور کیسے بولنا سیکھا؟ یہ ممکن ہے کہ آج کی دنیا میں بولی جانے والی ہزاروں کی تعداد میں زبانیں کسی ایک جد تک لے جائیں۔

مصنفوں اور زبان کے شوین ماہیکل روزن کی تحقیق

ارتقاء عمل میں انقلابی تبدلی

برطانیہ کی نیوکیسل یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر میگی ٹالر مین کا کہنا ہے کہ بنی نوع انسان واحد مخلوق ہے جو قوت گفتار رکھتے ہیں اور یہ بات اس کو دیگر جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔

بات کرنے کی صلاحیت انسان کے ارتقاء عمل میں ایک اہم مرحلہ تصور کیا جاتا ہے، ایک ایسی تبدلی جس نے پورا کھیل ہی بدلتے رکھ دیا اور اسی وجہ سے ہمیشہ سے انسان کو تجویز رہا ہے کہ زبان کب شروع ہوئی۔

برطانیہ کی کیمبریج یونیورسٹی میں انسانی ارتقا اور انصراف پولوچی کے پروفیسر رابرٹ فولی کا کہنا ہے کہ زبان ان چند پیچیدہ چیزوں میں شامل ہے جو ہمیں انسان بناتی ہیں۔

زبان پانچ لاکھ سال قدیم ہو سکتی ہے

آج کل دنیا میں 6500 زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن سائنس دان کس طرح اس بات کا تعین کر سکتے ہیں کہ کوئی زبان سب سے زیادہ قدیم ہے؟

اگر پوچھا جائے کہ سب سے قدیم زبان کون سی ہے تو ہم شاید سوچیں کہ یہ سنسکرت، قدیم مصری یا بابلی میں بولی جانے والی بابلی زبان ہو۔ پروفیسر ٹالر مین کا کہنا ہے کہ اس کا کہانی کے آغاز سے قریب کا بھی تعلق نہیں ہے۔ زیادہ تر وہ زبانیں، جنہیں ہم قدیم تصور کرتے ہیں وہ چھ ہزار سال پرانی ہیں اور بنیادی طور پر آج کل کی جدید زبانوں جیسی ہیں۔

زبان کی ابتدا کا پتالا گانے کے لیے ہم پچاس ہزار سال پہلے تک جا سکتے ہیں اکثر ماہر لسانیات کا نیا نیا ہے کہ یہ اس سے کہیں پرانی بات ہو سکتی ہے۔ پروفیسر ٹالر مین



زیادہ تر وہ زبانیں، جنہیں ہم قدیم تصور کرتے ہیں وہ چھ ہزار سال پرانی ہیں اور بنیادی طور پر آج کل کی جدید زبانوں جیسی ہیں

جب آپ دوسروں کو چیزوں کے بارے میں بتانے کے لیے جو فوری طور پر وہاں موجود نہیں ہوتے زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ شاید مختلف جگہوں پر مختلف اوقات میں کبھی ہورہا ہوتا ہے۔

پروفیسر ٹالر مین کہتے ہیں کہ شاید کھانے اور زندہ رکھنے کی خواہش نے انسان کو ایک دوسرے کو بتانے کی صلاحیت کو بڑھانے میں مدد کی۔ جیسا کہ مفت خواراک کی موجودگی۔

گپ شپ نے بھی شاید اس میں اپنا کردار ادا کیا

مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت زبان کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پروفیسر فولی کہتے ہیں کہ تعاون اس کی بنیاد ہے۔ اور ممکنہ طور پر زیادہ تراصل سماجی تعاون سماجی تربیت سے متعلق ہی ہوتا ہے۔ یہ براہے کہ زیادہ تر ہم جو بھی کہہ رہے ہوتے ہیں وہ صرف رابطے بنانے اور یہ جاننے کے لیے کہ کیا چل رہا ہے، یونیورسٹی آف کیمبرج کی ماہر لسانیات ڈاکٹر لورا رائٹ کہتی ہیں کہ عام طور پر ہونے والی بات چیت کی اہمیت کو کم یابے و قتعت نہیں کیا جاسکتا۔ گپ شپ، بات چیت، بڑا ہٹ روزمرہ کی گفتگو کا بڑا حصہ ہیں۔

کبھی کبھار زبان چیزوں کے بارے میں جاننے کا اصل ذریعہ ہوتی ہے بجائے اس کے کہ ہم اس کے ذریعے دوسروں کو کسی کام کا کہیں۔

اس جیں میں تغیر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ انسان کیوں قوت گویائی رکھتے ہیں اور لگنگو روں میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ ہمیں علم ہے اس جیں نے بولنے اور زبانوں کی ترقی میں اہم کردار کیا ہے کیونکہ جن لوگوں میں غیر تبدیل شدہ جیں پائی جاتی ہے انھیں بولنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ نیندر تھال میں جدید دور کہ انسانوں میں پائی جانے والی ایف اول ایکس پی 2 جیں ہی کی ایک ذرا مختلف شکل موجود تھی جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ ان میں آوازیں پیدا کرنے کی کچھ صلاحیت تھی۔

لیکن کیا انھوں نے بولنے اور آوازیں نکالنے کی مکمل صلاحیت حاصل کر لی تھی یہ ایک بالکل الگ سوال ہے۔

پروفیسر ٹالر مین کا کہنا ہے کہ آوازیں نکالنا باقاعدہ بولنے یا زبان کے برابر نہیں ہو سکتا اور زبان کیسے تشکیل پائی اس کا جینیاتی شواہد اور موجودہ علم سے پتا لگانا نہایت ہی مشکل ہے۔

کیا انسانی کھوپڑی کا سائز زبان کی تاریخ کے بارے میں بتانے میں مددے سکتا ہے؟

نہیں، اس کی ایک سادہ سی وجہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ کتنا بڑا دماغ زبان کو بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ پروفیسر ٹالر کہتے ہیں کہ ”حقیقت میں ایک نیندر تھال جو کہ قدیم دور میں موجود انسان تھے کا دماغ ہمارے دماغ سے بڑا تھا اور وہ ہم سے بڑے جانوروں میں شامل تھے،“

انسان کا پہلا لفظ شاید ہائے تھا

جب ہم قدیم ترین زبان کے بارے میں بات کرتے ہیں جو کہ موجودہ زبان جسے ہم آب بھی پڑھ رہے ہیں سے مختلف ہے تو ہم ممکنہ طور پر بتاسکتے ہیں کہ اس کا پہلا لفظ کیا ہوگا۔ پروفیسر فولی کے مطابق دیانتاری سے بات کی جائے تو ہمارے پاس اس کا کوئی سراغ نہیں۔

پروفیسر ٹالر مین کہتے ہیں کہ ابتداء میں انسان نے شاید ایک دوسرے سے تعاون شروع کیا اور زیادہ بات چیت کی تاکہ وہ اپنے ماحول کو جان سکے اور مختلف قسم کی خواراک کھاسکے۔

ہمارے آبا اجداد نے ابتداء میں فالتو اشیا کو اکھٹا کرنا شروع کیا اور جانوروں کی باقیات میں خود کو چھپانا شروع کیا۔

ہمارے آبا اجداد

پروفیسر ٹالر مین کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی مرے ہوئے جانور کی باقیات سے خیافت کرنا چاہتے ہیں تو پہلا حق تو جنگلی جانوروں کے جھٹے کا ہوگا۔ پھر آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کے دوست بھی ہوں کیونکہ یہ بہت خوفناک ہے۔

زبان بھی مددگار ہوتی ہے۔ اگر آپ باہر نکلے ہیں اور آپ کو کسی جانور کی اچھی حالت میں موجود باقیات ملی ہیں اور آپ اپنے دیگر ساتھیوں کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں قریب میں کچھ اچھا کھانے کے لیے موجود ہے۔

یہ انسانی ابلاغ کی ایک اور خوبی ہے جسے دوری یا آف لائن سوچ کہتے ہیں۔



زبان کے ارتقائیں یہ جاننا بھی بہت اہم حصہ ہوتا ہے کہ آپس میں رابطے اور تعلقات کیسے بنائے جائیں

ہم نے کب کہا نیا سنافی شروع کیں؟

پروفیسر ٹالر مین کہتے ہیں کہ زیادہ تر وقت زبان کا بیانیہ بنانے اور کہا نیا بیان کرنے اور رواج بنانے میں لگا۔ اس لیے ہمیں زبان کی ابتداء کے بارے میں جاننے کے لیے بہت پیچھے جانا ہوگا ممکنہ طور پر سینکڑوں ہزاروں سال پیچھے۔ پروٹو یونی ابتدائی زبان سے جدید زبان کی جانب قدم ایک بہت بڑی اور وقت و محنت سے لگائی جانے والی چھلانگ تھی۔ لیکن آج جو بھی زبانیں بولی جا رہی ہیں وہ یکساں طور پر پچیدہ ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ آج جو آبادیاں یہ تمام مختلف زبانیں بولتی ہیں اکثر مختلف مستوں میں بٹ جاتی ہیں جیسا کہ ایک لاکھ برس یا اس سے زیادہ عرصہ قبل موجود آبادیاں۔



دبئی کے شیخ محمد نے بیٹیوں کو انغو اکیا، بیوی کو دھمکا دیا، برطانوی ہائی کورٹ

تحریر: فرینک گارڈنر بی بی سی کے سکیورٹی امور کے نامہ نگار

عمر بیوی تھیں۔ ان کے 17 اور 11 سال کے دو بچے ہیں۔

شروع شروع میں تو ان کا خیال تھا کہ دونوں شہزادیاں جیسا کہ انہیں بتایا جا رہا تھا محفوظ ہیں۔ لیکن 2019 کے شروع میں شہزادی جیا کو شک ہونے لگا۔ اس دوران ان کے اپنے برطانوی باؤ دی گارڈ سے بھی تعلقات قائم ہو گئے۔

عدالت کو بتایا گیا کہ اس دوران شیخ محمد کی طرف سے ان کو دھمکانے کی ایک مہم شروع ہو گئی اور دوبار ان کے سرپال پستول ملا جس کا سیفیٰ کیچ کھلا ہوا تھا۔ ایک بار ان کے گھر کے باہر ہیلی کا پڑھی اتنا اور ان کو کہا گیا کہ انہیں صحراء میں ایک جیل میں لے جایا جائے گا۔

نج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ 'سن 2018 کے بعد سے باپ نے ماں کے ساتھ دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا ہے اور دوسروں کو بھی ان کی طرف سے ایسا ہی رویہ اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

شہزادی جیا کا فرار

شہزادی جیا اپریل 2019 میں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ برطانیہ آگئی تھیں۔ عدالت کو بتایا گیا کہ انہیں شیخ محمد کی طرف سے دھمکیاں مل رہی تھیں جن سے وہ خوفزدہ ہو گئی تھیں اور انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ ان کے بچوں کو زبردست دبئی لے جایا جائے گا۔

شہزادی نے عدالت کو بتایا کہ مئی 2019 میں انہیں کہا گیا تھا کہ تم اور تمہارے بچے کبھی بھی انگلینڈ میں محفوظ نہیں رہیں گے اور انہوں نے نظم بھی شائع کی جس کا عنوان تھا تم جی، تم مرگی۔

یہ فیصلہ اور ان میں قبول ہونے والے اذمات شیخ محمد کے لیے بہت شرمندگی کا باعث ہیں۔ شہزادی جیا کو تو دنیا میں زیادہ لوگ نہیں جانتے لیکن شیخ محمد عالمی سطح پر مشہور شخصیت ہیں خاص طور پر گھر سواری کی دنیا میں۔ وہ "گڈولفن، نامی اصلبل کے بانی اور مالک ہیں۔

ان کی برطانیہ کی ملکہ کے ساتھ تصاویر موجود ہیں۔ مشرق وسطی میں ان کا بڑا نام ہے۔ انہوں نے دبئی کو عالمی سیاحت اور تجارت کا مرکز بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ برطانوی ہائی کورٹ کے اس فیصلے کی انسانی حقوق کی تنظیموں نے تعریف کی ہے۔



انہوں نے اپنا مرضی کے خلاف واپس لے جانا، تشدد اور دھمکانے کی مہم۔ یہ دبئی کے ارب پتی حکمران شیخ محمد بن راشد المکتوم پران کی سابقہ اہلیہ شہزادی جیا بنت احسین کی طرف سے لگائے جانے والے وہ اذمات ہیں جو جمادات کو برطانیہ کی ایک ہائی کورٹ میں درست قرار پائے اور سلسلہ وار شائع کیے گئے۔

عدالت نے آٹھ ماہ پہلے شروع ہونے والے اس مقدمے کا فیصلہ شہزادی جیا کے حق میں سنایا جو گزر شستہ بر س اپنے دونوں بچوں کے ساتھ دبئی سے فرار ہو کر لندن پہنچی تھیں۔ انہوں نے اپنے دونوں سے کہا تھا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔

شیخ محمد نے اس مقدمے کے فیصلے کی اشتاعت پر پابندی لگوانے کی کوشش کی تھی لیکن عدالت نے اسے عوامی مفاد میں قرار دیتے ہوئے ان کی درخواست مسترد کر دی۔ دبئی کے حکمران کے بارے میں کہا گیا کہ انہوں نے عدالت کے سامنے پورا سچ نہیں بولا۔ عدالت نے گواہوں کے بیانات سننے کے بعد قرار دیا کہ شیخ محمد اپنی ایک اور شادی سے دونیوں کے انگو اور جبری دبئی واپسی کے ذمہ دار ہیں۔

شیخ زید سے برطانیہ کے علاقے سرے میں اپنی خاندانی رہائشگاہ سے سن 2000 میں فرار ہوئی تھیں لیکن انہیں شیخ کے ایجنتوں نے کبیر ج شاہزادے میں پکڑ لیا اور بیہوش کر کے دبئی لے گئے جہاں وہ اب بھی اپنی مرضی کے خلاف رہ رہی ہیں۔ کبیر ج شاہزادے پولیس کی طرف سے ان سے ملاقات کی درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔

شیخ لطیفہ نے سن 2002 اور 2018 اپنے والد کے خاندان سے فرار ہونے کی ناکام کوششیں کیں۔ پہلی کوشش کے بعد ان کے والد نے انہیں تین سال تک دبئی میں قید رکھا۔ دوسرا کوشش کے دوران انہیں انڈیا کی ساحلی حدود کے قریب سے پکڑا گیا تھا اور وہ اس کے بعد سے دبئی میں اپنے گھر میں نظر بند ہیں۔ نج نے شیخ لطیفہ کی طرف سے ایک ڈیلو میں لگائے گئے اذمات کو درست قرار دیا۔ نج نے کہا کہ شیخ محمد کی حکومت میں ان دونوں خواتین کی آزادی چھین لی گئی ہے۔

شہزادی جیا اور شیخ محمد

اردن کی 45 سالہ شہزادی جیا ملک کے سابق حکمران شاہ حسین کی بیٹی ہیں۔ ان کی سن 2004 میں 70 سالہ شیخ محمد سے شادی ہوئی تھی اور وہ ان کی چھٹی اور سب سے کم



دلی دیکھی؟ اور دیکھو گے؟

تحریر: آمنہ مفتی

دلی کے قصے ہم نے کتابوں میں پڑھے اور یاد کر لیے۔ دلی کے لئے کتابیں داستانیں بھی اور وہ روایتیں بھی جو کسی کتاب میں نہ لکھی گئیں بس سینہ گزٹ سے ہم تک پہنچیں۔ ان سب روایتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ یہ شہر بار بار لے گا؟ کیوں؟ اس بارے میں راویان خاموش ہوجاتے تھے۔ یہ بات شاید میلان کنڈی یاراک قاری سمجھ سکیں۔ گذشتہ ہفتے دلی ایک بار پھر لٹی تو جانے کیسے وہی سرورق پھٹی کتاب دلی کی ایک شام، ہاتھ آگئی۔

پیچ میں لکھنے ہی سال گزر گئے ہیں۔ دلی سے ان لوگوں کی قبروں کے سوا کیا رشته رہ گیا ہے کہ جن کی تصویروں کے لئے گرام بھی اب دھندا لاچے ہیں۔ مگر دلی کے لئے پرانسنسیت کے عمومی رشته کے سوا بھی کوئی دکھ ہے۔ یہ دکھ کیا ہے؟ یہ بھی میلان کنڈی یاراک کے ناول پڑھنے والے ہی جان سکتے ہیں۔

دلی کے حالات کشیدہ ہیں۔ قلیتوں کے ساتھ اکثریت کی بربریت کوئی نئی بات نہیں۔ کھلیل ہم نے اپنے ملک میں بھی بارہا دیکھا ہے۔ کمزور پر طاقتور غارتے ہی رہتے ہیں۔ شہریت کے قانون پر احتجاج سے بڑھتی ہوئی یہ بات دلی کے لئے تک آپنی۔

انداز بالکل وہی جو 2002 کے گجرات مسلم کش فسادات کا تھا۔ یہ انڈیا کا داخلی معاملہ ہے۔ ہم صرف انسانسیت کے ناطے افسوس کر سکتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کبھی ایسے واقعات نہ ہوں۔ اس سے آگے نہ اخلاقیات اجازت دیتی ہیں نہ دنیاداری۔

دین سے دنیا بھاری، دنیاداری تو بھائیں گے مگر زیندر مودی کے ان اقدامات سے دو باتوں پر، جن پر پہلے یقین نہ تھا، اب یقین کامل ہو چکا ہے۔

ایک تو یہ کہ پرتوہی راج چوہان نے واقعی راجہ باسک کو ناراض کر دیا تھا اور اب دلی کا تخت ہلتا ہی رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ جب ابو بغلہ دیش کے الگ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گیا کرتے تھے تو میں ان سے ایک سوال کرتی تھی۔ جب صدیوں مسلمان اور ہندو اکٹھے رہتے تھے اور بنگالی مسلمان ہونے کے باوجود

ہم سے الگ ہو گئے تو پاکستان کیوں بنایا گیا؟

اس سوال پر ابو، اس بچے کی سی مسکراہٹ سے جسے ابھی ابھی دلی دکھائی گئی ہوا اور وہ مزید دلی نہ دیکھنا چاہتا ہو، کہتے تھے بیٹے جی! پاکستان ناگزیر تھا۔

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہتے تھے اور وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے انھیں میرے اس سوال سے بہت دکھ پہنچتا تھا۔

آج دلی والوں کو بھی دلی دکھادی گئی اور ہم تو یہاں بیٹھے بیٹھے روز ہی دلی دیکھا کرتے ہیں۔ اب ایسا ہے کہ سائیں سائیں کرتے کافیوں میں ابو کی آواز گونج رہی ہے اور یقین سا ہوتا جا رہا ہے پاکستان واقعی ناگزیر تھا۔

دوچھتی میں جست کے سیاہ روغن سے رنگے ٹرنک میں بڑا سا ہضمی قفل لگا ہوا تھا۔ جسے سو جننوں سے ہونے کے بعد صندوق سے نکلی بھی تو ایک شکستہ، سرورق پھٹی کتاب۔ اس کتاب کے دوسرے صفحے پر یہ تحریر لکھی تھی۔

”دلی دل دینے کے قابل تھی مگر ہم ہی دل والے نہ تھے۔ یہ کتاب ہمارے ابا کے رشتے کے ماموں مرزا جمل بیگ کے سامان سے نکلی۔ لکھنے والی کوئی خاتون تھیں۔“

یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی کے بارے میں مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ جو بچہ بڑوں کی محفل میں زیادہ شور مچاتا، کوئی نہ کوئی پکڑ کر اسے دلی دکھادیتا۔ یہ دلی دکھانا کیا تھا؟ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے بچپن میں دلی دیکھی ہو۔

قارئین کی آسانی کے لیے بتاؤں کہ دلی دکھانے والا اس کا رخیر کی ابتداء یں کرتا کہ شریر بچے کے دونوں کان ہتھیلوں سے دبا کر پکڑ لیے جاتے اور پھر یوں، ہی کھوپڑی پیچکائے پیچکائے اسے زمین سے فٹ، سوافت اٹھا کر سامنے اشارہ کرتا وہ دیکھو سامنے دلی، آئی نظر؟

دلی دیکھنے والے کے کافیوں میں سائیں سائیں ہو رہی ہوتی اور سارا جسم بلی کے منہ سے لٹکے بلونگٹرے کی طرح گردن کے زور پر جھوول رہا ہوتا۔ ایسے میں اگر دلی دیکھنے کی کوئی خواہش ہوتی بھی تو وہیں دم توڑ جاتی تھی۔ چلا چلا کر کہتے ہیں، بس، دیکھ لی دلی۔ اس پر پوچھا جاتا اور دیکھنی ہے؟ اب ایسی دلی کوں کافر مزید دیکھنا چاہتا؟ چلا چلا کر یقین دلایا جاتا کہ دلی کا یہ پھیرا کافی ہے۔ اس کے بعد دلی دیکھنے والے ایسے چلکے بیٹھتے کہ سانس کی آواز بھی بمشکل سنائی دیتی۔

اس کھلیل کے پیچھے جانے کیا روایت ہو گی؟ مگر جو بھی روایت ہو گی وہ دلی کے خوفناک ماضی سے ضرور جڑی ہوئی ہو گی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ پرتوہی راج چوہان نے اپنا راج ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے لوہے کی ایک تخت حساب کتاب کر کے ایسے ٹھنکوائی تھی کہ راجہ باسک (ناگ دیوتا) کو اپنے پار تخت تلے کیل دیا۔

بادشاہوں کا یہ ہے کہ انھیں بدگمانی کا مرض ہوتا ہے۔ سنا ہے پرتوہی راج چوہان نے راج ہٹ میں سب کے منع کرنے کے باوجود وہ میخ نکلا کر دیکھی کہ آیا واقعی راجہ باسک کیل دے گئے یا نہیں؟ میخ کا آخری سراخنوم خون تھا۔ بادشاہ کو تو یقین آ گیا مگر راجہ باسک تربا کے کہیں کے کہیں نکل گئے اور پھر دلی میں کبھی وہ نہ ہو سکا جو پرتوہی راج چوہان نے چاہتا، یعنی ان کی حکومت۔

دلی جو لاہور ہی کی طرح شہر نگاراں ہے، اس شہر کو بسانے والوں میں ہمارے بڑے شامل تھے۔ اس کی مٹی میں ہماری کئی نسلیں فن ہیں مگر پاکستان بننے ہی ہمارے بڑوں نے جانے کوں تی دلی دیکھی تھی کہ کبھی پلٹ کر ذکر بھی نہ کیا۔

کورونا و ائرس: اس بیماری کی علامات کیا ہیں اور اس سے کیسے محفوظ رہا جائے؟

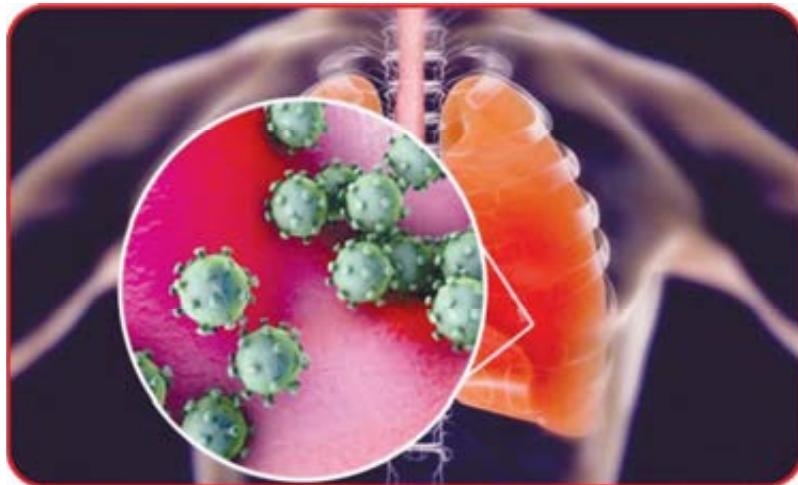
تحریر: جیمز گلیگر

لیکن یہ بھی غیر واضح ہے کہ بلکی پھلکی علامات والے کتنے کیسز ہیں جو روپرٹ ہی نہیں ہوئے، اس صورت میں شرح اموات کم بھی ہو سکتی ہے۔
ہر سال ایک ارب افراد نفلویزما کاشکار ہوتے ہیں اور دولاکھوے ہزار سے چھ لاکھ بچپاس ہزار افراد ہلاک ہوتے ہیں۔ فلوکی شدت ہر سال بدلتی ہے۔
کیا کورونا و ائرس کا علاج ممکن ہے؟

تا حال اس کا علاج بنیادی طریقوں سے کیا جا رہا ہے، مریض کے جسم کو فعال رکھ کر، سانس میں مدد فراہم کر کے، تا وقت کہ ان کا مدفعتی نظام اس و ائرس سے لڑنے کے قابل ہو جائے۔

تاہم اس کے لیے دیکھیں کی تیاری کا کام جاری ہے اور امید ہے کہ اس سال کے آخر تک اس کی دوا انسانوں پر آزمائی شروع کر دی جائے گی۔

ہسپتالوں میں و ائرس کے خلاف پہلے سے موجود دواوں کا استعمال شروع کر رکھا ہے تاکہ دیکھا جاسکے کے آیا ان کا کوئی اثر ہے۔



ہم خود کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟
عالیٰ ادارہ صحت کا کہنا ہے:

اپنے ہاتھ ایسے صابن یا جیل سے دھونیں جو و ائرس کو مار سکتا ہو۔
کھانستے یا چھینتے ہوئے اپنے منہ کو ڈھانپیں، بہتر ہو گا کہ ٹشو سے، اور اس کے فوری بعد اپنے ہاتھ دھونیں تاکہ و ائرس پھیل نہ سکے۔

کسی بھی سطح کو چھو نے کے بعد اپنی آنکھوں، ناک اور منہ کو چھو نے سے گریز کریں۔ و ائرس سے متاثر ہونے کی وجہ سے یہ آپ کے جسم میں داخل ہو سکتا ہے۔
ایسے لوگوں کے قریب مت جائیں جو کھانس رہے ہوں، چھینک رہے ہوں یا جنہیں بخار ہو۔ ان کے منہ سے و ائرس والے پانی کے قطرے نکل سکتے ہیں جو ہزاروں افراد کا علاج اب بھی جاری ہے اور شرح اموات بڑھ بھی سکتی ہے۔

نامہ نگار برائے سائنس اور صحت

عالیٰ ادارہ صحت کے مطابق پھیپھروں کے شدید فکر میں مبتلا کرنے والا و ائرس جو چین سے شروع ہوا تھا اب 100 سے زیادہ ممالک تک پھیل چکا ہے۔ دنیا میں اب تک کورونا و ائرس سے ایک لاکھ سے زیادہ افراد متاثر ہو چکے ہیں جبکہ 3600 سے زائد ہلاک ہوئے ہیں۔

یہ و ائرس پاکستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں بھی پہنچ چکا ہے۔ پاکستان میں تا حال اس کے 18 مریضوں کی تصدیق ہوئی ہے۔
اس کی علامات کیا ہیں؟

یہ بظاہر بخار سے شروع ہوتا ہے جس کے بعد خشک کھانی آتی ہے۔ ایک ہفتے بعد سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے کچھ مریضوں کو ہسپتال لے جانے کے نوبت آ جاتی ہے۔

واضح رہے کہ اس افیکشن میں ناک بہنے اور چھینکنے کی علامات بہت کم ہیں۔

عالیٰ ادارہ صحت کے مطابق

افیکشن کے لاحق ہونے سے لے کر علامات ظاہر ہونے تک کا عرصہ 14 دنوں پر محيط ہے۔ لیکن کچھ محققین کا کہنا ہے کہ یہ 24 دن تک بھی ہو سکتا ہے۔

اس و ائرس سے متاثر ہونے والے 44000 مریضوں کے ڈیٹا کے جائزہ کے بعد عالیٰ ادارہ صحت ڈبلیو ایچ او کا کہنا ہے کہ 81 فیصد افراد میں اس کی بلکی پھلکی علامات ظاہر ہوئیں۔

14 فیصد میں شدید علامات ظاہر ہوئیں۔ پانچ فیصد لوگ شدید بیمار پڑ گئے۔ اس بیماری جسے کوڈ 19 کا نام دیا گیا سے مرنے والوں کی شرح ایک سے دو فیصد ہی لیکن ان اعداد پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔
ہزاروں افراد کا علاج اب بھی جاری ہے اور شرح اموات بڑھ بھی سکتی ہے۔

گرمیاں اس وبا کو روک دیں گی۔

یہ شروع کیسے ہوا؟

یہ وائرنس خود کوئی نیا نہیں ہے۔ یہ صرف انسانوں میں نیا ہے۔ یہ ایک مخلوق سے دوسری میں آیا ہے۔

کئی ابتدائی کیسز چین میں وہاں کے ایسے بازار سے جوڑی گئے جہاں جانوروں کا گوشت ملتا تھا۔

چین میں کئی لوگ جانوروں سے بہت قریب ہوتے ہیں جس سے یہ وائرنس منتقل ہو سکتا ہے۔ اور گنجان آباد شہروں میں یہ یہاں یا آسانی سے پھیل سکتی ہیں۔ سارس نامی یہاں ری بھی کورونا وائرنس سے ہی شروع ہوئی تھی۔ یہ چگاڈڑوں سے شروع ہوئی اور سیوٹ کیٹ سے ہوتی ہوئی انسانوں تک پہنچی تھی۔

سارس کی وبا نے چین میں سال 2002 کے دوران 774 افراد کو ہلاک کیا جبکہ آٹھ ہزار سے زائد اس سے متاثر ہوئے۔ حالیہ وائرنس کورونا وائرنس کی یہ ساتوں قسم ہے اور اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی گئی۔ لیکن جب حالات سنبل جائیں گے تو سائنسدان اس کا قریبی جائزہ لیں گے۔



کہ فضائیں ہو سکتے ہیں۔ ایسے افراد سے کم از کم ایک میٹر یعنی تین فٹ کا فاصلہ رکھیں۔ اگر طبیعت خراب محسوس ہو تو گھر میں رہیں۔ اگر بخار ہو، کھانی یا سانس لینے میں دشواری ہو تو فوری طبی مدد حاصل کریں۔ طبی حکام کی ہدایت پر عمل کریں۔

کتنی تیزی سے پھیل رہا ہے؟

ہر روز ہزاروں نئے کیسز رپورٹ ہو رہے ہیں۔ تاہم تجربی کاروں کا کہنا ہے کہ اصل میں یہ اس سے کہیں بڑے پیمانے پر پھیل رہا ہو سکتا ہے کم سے کم اس سے 10 گناز یادہ جتنا کہ سرکاری اعداد و شمار میں بتایا جا رہا ہے۔

یہاں تک جنوبی کوریا، اٹلی، ایران میں پھیل چکا ہے جس کے بعد یہ خدشہ ہے کہ یہ عالمی وبا بن جائے گی۔ کسی بھی نیشن کو عالمی وبا اس وقت قرار دیا جاتا ہے جب وہ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل کر خطرہ بن جاتی ہے۔

عالمی ادارہ صحت کا کہنا ہے کہ وہ اس تعداد کے حوالے سے فکر مند ہیں خصوصاً ایسے کیسز کے بارے میں جن کا بلا واسطہ تعلق چین سے ہے۔ ادارے کا کہنا ہے کہ وائرنس کے موجود ہونے کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔

موسم سرما میں سردی اور فلوکی وجہ سے یہ زیادہ تیزی سے پھیلا، امکان ہے کہ موسم میں تبدیلی اس وبا کے پھیلاو کو روکنے میں مدد دے گی۔

تاہم کورونا وائرنس کی طرح کا ایک وائرنس مُدل ایسٹ ریپارٹریٹری سینڈروم گرمیوں میں سعودی عرب پھیلتا ہے۔ اس لیے اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ

امریکہ کے جنگی بحری بیڑے "روزویلٹ" پر کرونا وائرنس کے ہنکار اہلکاروں کی موجودگی سے امریکی بحری فوج کے 4 ہزار سے زائد اہلکاروں کی زندگیاں داؤ پر لگ گئیں، جہاز کی کپتان نے فوری مدد کے لیے پینٹا گون کو خط لکھ دیا۔ امریکی نشریاتی ادارے کے مطابق بحری بیڑے کے کپتان بریٹ کروز بیڑ نے چار صفحات پر مشتمل ایک خط میں پینٹا گون کو آگاہ کیا کہ بحر اکاہل کے ایک امریکی علاقے گوام میں ان کا بیڑا موجود ہے اور کرونا وائرنس بیڑے پر تیزی سے پھیل رہا ہے جس کے باعث چار ہزار اہلکاروں کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔



دوسٹو دوسری جنگ عظیم زوروں پر ہتھی

مازکرات ختم ہو گے تمام رہنمای خاموشی سے اپنے ممالک کی طرف روانہ ہو گئے لیکن کچھ ناہوا، ان مازکرات کے کئی سال بعد ایک سوویت یونین سے تعلق رکھنے والا مترجم جو مازکرات میں شریک تھا اور اس سارے تھے کو جانتا تھا اتفاق سے چرچل کو کسی تقریب میں ملا اور باتوں باთوں میں چرچل سے اس کے لکھے مہم اور خطرناک جملے کا مطلب پوچھ بیٹھا جس پر تھے لگاتے ہوئے چرچل نے جواب دیا بھائی اس دن جب مازکرات ہو رہے تھے روزویلٹ نے مجھے ایک پرپی دی جس پر لکھا تھا کے مسٹر چرچل، آپ کی پتوں کی زپ کھلی ہے مہربانی کر کے بند کر لیں" میں نے وہ پرپی پڑھی اور پھر ایش ٹرے میں جلا دی اور دوسری پرپی پر میں نے جواب لکھا کے بھائی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں یہ پرانا عقاب ہے اپنے گھونسلے سے اڑنہیں سکے گا!"

نتیجہ:

دوستو اپنے آپ کو سیاسی اور مذہبی تجربیوں میں بہت زیادہ غرق نہ کیا کریں اور ان سازشوں کے تانے بانے نا بنانا کریں کیوں کے جو نظر آتا ہے اکثر ویسا بلکل بھی نہیں ہوتا جیسا اپ فرض کے کے بیٹھ جاتے



لاہور انٹر نیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔
ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی،
معاشرتی اور ثقافتی صورت حال کا تجزیہ
تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق
اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

اس جنگ کے دوران دنیا کی تین بڑی طاقتیوں کے درمیان سہ فریقی مازکرات شروع ہوئے، موجودہ روس میں ہونے والے اس مازکرات میں سوویت یونین کے اسلام، برطانوی وزیر اعظم چرچل، اور امریکی صدر روزویلٹ شریک تھے، مازکرات کے دوران امریکی صدر روزویلٹ نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کچھ لکھا اور چرچل کے حوالے کر دیا، چرچل نے پڑھنے کے بعد اس کاغذ کے ٹکڑے کو سیگریٹ کے زریعہ جلا کر ایش ٹرے میں پھنس دیا اور جواب میں ایک اور کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ تحریر کر کے روزویلٹ کے حوالے کر دیا، روزویلٹ نے وہ جواب پڑھا اور کاغذ کے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں دیے گئے پھنس دیا، کیوں کے روزویلٹ سموکنگ نہیں کرتا تھا اس لیے وہ اس ٹکڑے کو جلا نہ سکا، جیسے ہی یہ سب مازکرات کی میز سے اٹھ سوویت نیشنل سروس کے کارندوں نے جا کر اس کاغذ کو تحویل میں لے لیا جو جل نا پایا تھا، جب سویت ایجنسیوں نے چرچل کے لکھے کاغذ کو پڑھا تو اس پر کوڈ ورڈ میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا، ڈرنے کی ضرورت نہیں کسی بھی صورت میں پرانا عقاب گھونسلے سے نہیں اڑ سکتا"

سوویت نیشنل سروس نے ان الفاظ کا تجزیہ شروع کر دیا اور آخر کا نتیجہ نکالا گیا کہ یہ ہمارے کسی بوڑھے شخص کو قتل کرنے کے بارے میں بات ہو رہی تھی، اور وہ بوڑھا کوئی اور نہیں ہمارا صدر اسلام ہی ہے، انہوں نے اس کوڈ کا مطلب سمجھنے کے لیے مذہبی کتاب بائبل، مغرب کے مشہور مصنف شیکسپیر سمیت مختلف لوگوں کی کتابوں سے بھی مدد لی کے آخر اس جملے کا مطلب کیا ہو سکتا ہے،

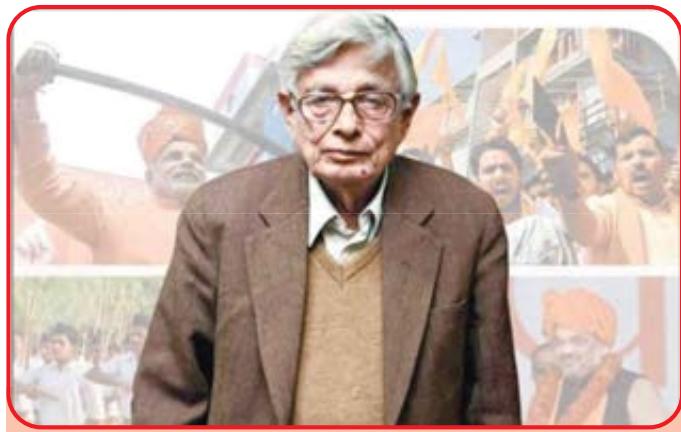
یہ بات تو رویوں پر واضح ہو گئی تھی یہ سویت صدر کو قتل سے مطلق بات چیت ہے اور اس جملے میں پرانا عقاب اسلام ہے، اور گھوں سلا سویت یونین ہے۔ احتیاطی تدابیر شروع کر دی گئیں، صدر کے گارڈ کو تبدیل کیا گیا، خنثیہ ایجنت بڑھادئے گئے، اور اس کے علاوہ تمام ضروری سامان اور گولہ بارود کے ذخائر کی حفاظت کا بھی دوبارہ نئے سرے سے بندوبست کیا گیا،

”بھارتی قوم پر تاریخ کے نام پر جھوٹ مسلط ہو چکے،“

تحریر: سید عاصم محمود

ریاست میں بستیاں بسائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تین ہزار سال قبل وسطی ایشیا سے آنے والے قبائل نے کشمیر میں اولیں قائم کیں۔ یہ قبائل مظاہر پرست تھے اور بہت پرست بھی۔ دو ہزار سال قبل بدھ مت کے نام لیوا بادشاہ کشمیر پر حکمرانی کرنے لگے۔ پھر شیوا دیوتا کے پیروکاروں نے وہاں حکمرانی قائم کر لی۔ بارہویں صدی کے بعد ریاست پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس دوران یونانی اور افغان بھی کشمیر میں آتے جاتے رہے۔

غرض کشمیر کا علاقہ پچھلے تین ہزار سال سے مختلف اقوام اور مذاہب کی آماج گاہ رہا ہے۔ اسے ہندو شدت پسندوں کی جاگیر قرار دینا بالکل غلط ہے۔ مگر وہ اب طاقت کے بل بوتے پر تاریخی حقائق جھٹلا کر اپنے جھوٹوں پر مبنی تاریخ بھارتی عوام پر ٹھونسندا چاہتے ہیں۔ ان کا خاص نشانہ مسلم اقلیت ہے کیونکہ وہ ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کر چکی۔ نیز بھارت میں مذہبی، تہذیبی، عمرانی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی سطح پر مسلمانوں کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ ہندو شدت پسند تاریخ مسخ کر کے جدید بھارت سے انہی اثرات کا خاتمه چاہتے ہیں۔ جب ان کا یہ طریق واردات سمجھ میں آجائے تو یہ بات سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ آخر وہ مسلم اقلیت کے درپے کیوں ہیں؟ اسے ختم کیوں کرنا چاہتے ہیں؟



متاز مورخ و دانشور، پروفیسر عرفان جیبی کے ہندو شدت پسندی کی بیت آشکارا کرتے انکار و نظریات

اٹھا سالہ پروفیسر عرفان جیبی کا شمار بھارت کے متاز ترین تاریخ دانوں میں ہوتا ہے۔ والد بھی منفرد دانشور تھے۔

آسکس فورڈ یونیورسٹی سے علم تاریخ میں ڈی لٹ کی ڈگری لی۔ کئی برس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے منسلک رہے۔ آج بھی پیرانہ سالی میں بطور پروفیسر ایریٹس طالبان علم کی علمی پیاس بجھا رہے ہیں۔ 2005ء میں بھارتی حکومت نے پدم شری اعزاز سے نوازا۔ تاریخ تحریک آزادی ہند اور عمرانیات کے موضوعات پر گیارہ کتب شائع ہو چکیں۔ ترقی پسند، معتدل مزان اور دلیر دانش ور ہیں۔ بھارت میں بڑھتی انتہا پسندی کو کڑے الفاظ میں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ تقریروں، مضامین اور گفتگوؤں سے کشید کردہ آپ کے علمی و سیاسی افکار و خیالات کا انتخاب نذر قارئین ہے۔

جوں و کشمیر میں کیا ہوا؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھیے، موجودہ شدت پسند بھارتی حکمران طبقے کا طریق واردات یہ ہے کہ وہ تاریخ کے نام پر جھوٹ بول کر اپنے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے علم تاریخ کو بھی اپنا آہ کار بنا لے۔ ریاست جموں و کشمیر ہی کو لیجیے۔ سنگھ پر یوار (آر ایس ایس، بی جے پی وغیرہ) کے رہنماؤں کا دعوی ہے کہ ماضی میں ہندو بادشاہ ریاست جموں و کشمیر پر حکمرانی کرتے رہے۔ اسی لیے یہ ریاست ہندو راشٹریہ کا ضرور حصہ بنے گی۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ ان لیڈروں کا دعوی ہے کہ ہزاروں سال پہلے ہندوؤں نے



ریاست جموں و کشمیر بھارت کی واحد نمایاں مسلم اکثریتی ریاست تھی۔ وہ ہندو راشٹریہ کے منصوبے میں رکاوٹ بن گئی۔ اسی لیے جموں و کشمیر کی ریاست حیثیت ختم کر کے اسے وفاقی علاقہ بنادیا گیا۔ درحقیقت آڑٹکل 370 کے

بنتا کر دیا۔ انھیں ذلت اور بے بھی کا احساس بھی ہوا۔ یہ ہم پڑھنے بھائے لاکھوں بھارتی مسلمانوں پر ”غیر قانونی“ ہونے کا طھپہ لگاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے مسلمانوں کی کثیر تعداد میں کے خلاف احتجاج کرنے لگی۔ باشور غیر مسلموں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ زبردست احتجاج سے مودی حکومت پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی۔ اسے یہ بھی احساس ہوا کہ بھارتی مسلمانوں کے احتجاجی مظاہروں سے عرب حکومتوں کو بڑا غلط پیغام جارہا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مودی حکومت کی پسپائی عارضی ہے۔

وہ موقع پا کر نیشنل رجسٹر آف سٹیزن کی مہم شروع کر اادے گی۔ آغاز ان ریاستوں سے ہو گا جہاں بی بے پی حکمران ہے۔ بی بے پی مسلم مختلف ایجنسیوں پر عمل کر کے ہی بھارتی عوام میں مقبولیت پاتی ہے۔ اس کی ہندو شاونیت کے مظاہرے یہود بھارت میں بھی جنم لے چکے۔ مثلاً برطانیہ کے حالیہ ایکش میں بھارتی نژاد ووٹروں نے لیبر پارٹی کو ووٹ نہیں دیئے کیونکہ اس کے سربراہ، جیری کاربن نے کشمیر اور بھارتی مسلمانوں کے معاملے میں نزیندر مودی حکومت پر سخت تقدیم کی تھی۔

بی بے پی کا (سابق) صدر، امیت شاہ اور مودی کہتے ہیں کہ نیشنل رجسٹر کی مہم سے مسلمانوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان ان سے کیوں خوفزدہ نہ ہوں؟ امیت شاہ انھیں ”دیمک“ کہہ کر پکار چکا۔ پھر انہی دونوں لیڈروں کی موجودگی میں گجرات میں مسلمانوں کا خوفناک قتل عام ہوا۔ یہ دونوں اتنے زیادہ مسلم مختلف ہیں کہ ہندوستانی تاریخ سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ٹیپو سلطان، اور نگ زیب عالمگیر، محمد علی جناح اور دیگر مسلم رہنماں کے خاص ٹارگٹ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر نیشنل رجسٹر کی مہم شروع ہوئی تو خصوصاً کروڑوں بھارتی مسلمانوں پر عذاب نازل ہو گا۔

ان میں سے بیشتر غریب ہیں۔ ان بیچاروں پر آفت ٹوٹ پڑے گی۔ اپنی شہریت ثابت کرنے کی خاطر انھیں ایک سے دوسری جگہ دھکے کھانے پڑیں گے۔ نیزو سعی پیانے پر کرپشن کا آغاز ہو گا۔ اپنی

خاتمے سے مودی حکومت ریاست جموں و کشمیر پر قبضہ کر چکی۔ اب کشمیری کوئی حقوق نہیں رکھتے اور نہ آزاد ہیں۔ وہ مودی حکومت کے مکمل بن چکے۔ اب جلدیا بدیر کشمیر میں مسلم اکثریت ختم ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوری اور عوام دوست نہیں، فاشٹ حکمران حکمرانی کر رہے ہیں۔ بھارتی آئین نے دیگر ریاستوں کو بھی خود مختاری دے رکھی ہے مگر انھیں نہ چھیڑا گیا کیونکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں۔

وہی ایکش

بھارتی دارالحکومت کے حالیہ ایکش میں سنگھ پر یوار کے لیڈروں کی سرتوقری سعی رہی کہ ہندو ووٹر اپنے پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں مگر وہ ناکام رہے۔ وہی کے روادار اور باشور شہریوں نے ان کی شرائیز مہم مسترد کر دی۔ اسی جماعت کو ووٹ دیا جو منہب کوآل کارنہیں بناتی بلکہ مسائل حل کرنے پر توجہ دیتی ہے۔ اس بار بھی بی بے پی نے نفرت انگریز انتخابی مہم میں تاریخ کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ وزیر اعلیٰ یوپی، یوگی ادھیہ ناتھ نے اسلامی ثقافت کی نشانی ”بریانی“ کو گالی کا مترا داف بنا دala۔ بعض لیڈروں نے ایکش کو بھارت اور پاکستان کے مابین معرکہ قرار دیا۔ ایک لیڈر جلسے میں چلائے، ”شاہین باغ“ کے غداروں کو گولی مار دو۔ چنان چ وہاں گولیاں چلانے کے واقعات پیش بھی آئے۔ امیت شاہ ووٹروں سے بولے، اتنی زور سے ووٹ کا بٹن دبانا کہ شاہین باغ میں زلزلہ آجائے۔ ذرا سوچیے، کیا قومی مقام و مرتبے کے لیڈروں کو ایسی پوچ باتیں کرنا زیب دیتا ہے؟ پچھلے دنوں میں شاہین باغ گیا تھا۔ وہاں ایک خاتون نے کہا ”ہم غریب ہیں مگر انسان بھی ہیں۔ ہم ایکش میں مودی کو ایسا جھنکا دیں گے کہ وہ اپنی ساری نفرتیں بھول جائے گا۔“

نیشنل رجسٹر آف سٹیزن کی مہم

یہ مہم بھی بھارتی مسلمانوں کے خلاف ہے تاکہ انھیں معاشرے میں عضوِ معطل بنادیا جائے۔ اس نے بجا طور پر مسلمانان بھارت کو خوف و پریشانی میں



عیاں ہے کہ مودی حکومت متعصب بن چکی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ پاکستان، بُلگہ دیش اور دیگر ممالک میں ہندوؤں پر ظلم ہو رہا ہے۔ اسی لیے انہیں بھارت میں داخلے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ مگر برما بھی بھارت کا ہمسایہ ہے جہاں روہنگیا مسلمان اکثریتی فرقے کے ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ لیکن روہنگیا بھارتی شہری نہیں بن سکتے کیونکہ وہ مسلمان ہیں۔

مذہبی بنیاد پر تقسیم

بیجے پی کے رہنمایا گلریس پر الزام لگاتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان مذہبی بنیاد پر تقسیم ہوا۔ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ حقیقت میں یہ ہندوانتہاپسندی در ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستانی قوم کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کیا۔ انہوں نے ہی مختلف مذہبی گروہوں کے مابین نفرت و دشمنی کی آگ بھڑکائی تاکہ اپنے مفادات پورے کر سکیں۔ ہندوانتہاپسندی کا اہم رہنمای، دمودر ساوار کر 1937ء میں یہ نظریہ پیش کر چکا تھا کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آرائیں ایس کے سر برآ، گواہ کرنے اپنی دنوں یہ اشتغال انگریز بیان دیا کہ مستقبل کی ہندو ریاست میں مسلمان شہری بن کر نہیں رہ سکتے۔ غرض یہ شدت پسند ہندو ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستانی عوام کو مذہبی جنگ کے الاؤ میں دھکیل دیا۔

بھارتی عدالت آرائیں ایس کے زیر اثر



بھارت کی جدید تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک ہندوانتہاپسند حکومتی ڈھانچے سے دور رہے، اکاڈمیک فرقہ وارانہ فساد چھوڑ کر بھارتی معاشرے میں بالعموم رواداری اور برداشت موجود تھی۔ ہر رنگ، نسل اور مذہب کے لوگ مل جل کر رہتے۔ مگر 1980ء کے بعد ہندوانتہاپسندی نے تیزی سے فروغ پایا تو یہ ملک مذہبی دنگے فساد کا مرکز بن گیا۔ میسوں صدی کے اوخر میں بیجے پی نے حکومت سنپھال لی۔ تب سے پوری سرکاری مشینزی یعنی فوج، انتظامیہ، عدالتی، افسروں کی تربیت میں بھارتی شہری بن سکتے ہیں۔ قانون شہریت کی ترمیم سے یہ بھی

شہریت بچانے کی خاطر مسلمان اپنی جمع پوچھی کر پٹ سرکاری افسروں کے ہوالے کرنے پر مجبور ہوں گے جو کسی نہ کسی طریقے سے مسلمانوں کو بلیک میل کر کے ان کی بے بُلی سے فائدہ اٹھائیں گے۔ گویا اس مہم سے مختلف فرقوں کے مابین نفرت بڑھے گی اور بے چینی بھی۔ بیجے پی نے پہلے مذہب کو تھیار بنا کر اقتدار پایا۔ اب وہ علم تاریخ کے نئے تھیار سے بھی معاشرے میں نفرت و دشمنی ابھار کر اپنے اقتدار کو دوام بخشنا چاہتی ہے۔ انسان دوست سیاسی جماعتوں نے اتحاد نہیں کیا، تو بیجے پی کا نفرت پر مبنی فلسفہ بھارتی معاشرے کو تباہ کر سکتا ہے۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی

مودی حکومت کے دور میں خطراں کے ترین بات یہ ہے کہ وہ اسکول کا الجوں میں نیانصاب تعلیم رائج کر رہی ہے۔ اس نئے نصاب تعلیم میں تاریخ کے حقائق توڑ مرور کر پیش کیے جا چکے۔ ایک انسان ماضی کی بابت کچھ نہیں جانتا تو یہ تشویشناک امر نہیں۔ لیکن اسے تاریخ کا نام دے کر جھوٹ اور غلط باہم پڑھائی جائیں گے، تو اس میں منفی ذہنیت جنم لیتی ہے۔ وہ پھر کسی نہ کسی وجہ سے دیگر مذہبی و نسلی فرقوں کا دشمن بن جاتا ہے۔ بیجے پی کا طریقہ واردات بھی یہی ہے کہ ہندو عوام کو اقلیتی فرقوں کے خلاف ابھار دیا جائے۔ مطالعہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ماضی میں ہندوستان کے کئی بادشاہ اعتماد اپسند، روادر اور انسان دوست گزرے ہیں۔ مثلاً اشوك عظیم ہرگز متعصب حکمران نہ تھا۔ مگر بیجے پی کے دور حکومت میں یہ خوبی خامی بن چکی، اسی لیے نصاب تعلیم سے اشوك عظیم کا تذکرہ نکال کر ان بت پرست بادشاہوں کے حالات دے دیتے گئے جنہوں نے بدھ مت اور جین مت کے پیروکاروں کا قتل عام کیا تھا اور وہ ہندوستان میں بہمن مت (المعروف بہ ہندو مت) کی حکمرانی چاہتے تھے۔

مسلم دشمن قانون شہریت

مودی حکومت نے قانون شہریت میں بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر ترمیم کی۔ اب پڑوںی ممالک کا کوئی مسلمان بھارتی شہری نہیں بن سکتا۔ البتہ وہاں مقیم ہر غیر مسلم کو بھارتی شہری بننے کی اجازت ہے۔ اپنی اپنی اقلیتوں کو تحفظ دینے کے لیے 12 اپریل 1950ء کو وزیر اعظم بھارت، پنڈت نہرو اور وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان نے ایک معاہدہ کیا تھا۔ ترمیم نے اس معاہدے کو بھی بے اثر بنا دیا۔ تاہم اس ترمیم کا اصل نشانہ بُلگہ دیش ہے۔ مودی حکومت بھارت میں بُلگہ دیشی مسلمانوں کی آمد ہر قیمت پر روکنا چاہتی ہے تاہم بُلگہ دیش کے ہندو بھارتی شہری بن سکتے ہیں۔ قانون شہریت کی ترمیم سے یہ بھی



آثار قدیمہ کے علوم سے انصاف نہیں کیا جانے کیوں ان کی نگاہوں سے یہ سچ اچھل رہا کہ مغل دور حکومت ایودھیا علاقہ اودھ کا صدر مقام بن گیا تھا۔ اور اس علاقے یا صوبے میں مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ اسی لیے انہوں نے نہ صرف ایودھیا میں مساجد تعمیر کیں بلکہ قریب ہی ایک نئے شہر (فیض آباد) کی بنیاد رکھی۔ لیکن سپریم کورٹ کے بوجوں نے یہ مفروضہ گھٹلیا کہ مغل دور حکومت میں مسلمان بابری مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔

یہ سچ ایک خیالی بات، ہوائی ہے جو بوجوں نے اڑائی۔ ان بوجوں نے پھر مکمل آثار قدیمہ کے ماہرین سے بھی تقاضہ نہیں کی۔ ان ماہرین کی مہارت و علم کا یہ عالم تھا کہ وہ بابری مسجد کو بطور مسجد نہیں پہچان سکے اور پورے کیس میں اسے ”تنازع عمارت“ کہتے رہے۔ انہی سرکاری موخرین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ماضی میں بابری مسجد کے نیچے پچاس ستونوں والا (رام) مندر کھڑا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ کسی ستون کی بنیاد بطور ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ بس مٹی کی ڈھیر یاں دکھا کر انہیں بنیادیں بنادیا گیا۔

سپریم کورٹ نے بابری مسجد پر مسلمانوں کا حق اس اس لیے مسترد کر دیا کہ مسلمان یہ ثابت نہیں کر سکے، 1857ء سے قبل وہاں نماز پڑھی جاتی تھی۔ جبکہ بابری مسجد (کے صحن) میں ہندو طویل عرصے سے رام کی پوجا کر رہے تھے۔ یہ بات بطور ثبوت تسلیم کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے بابری مسجد کی جگہ رام مندر تعمیر کرنے کا فیصلہ دے ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے ثبوت کی بنیاد پر ماضی میں تعمیر کردہ مذہبی عمارت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن ہے؟ سپریم کورٹ کے ایک سچ نے فیصلہ لکھتے ہوئے لکھا: ”ہندوؤں کا دھرم ہے، جس جگہ بابری مسجد تعمیر ہوئی وہاں شری رام نے جنم لیا تھا،“ گویا سچ نے فیصلہ سناتے ہوئے دیوالا کو حقائق پر ترجیح دی۔ جبکہ جادوگروں کی طرح ماضی کے واقعات

اور پولیس میں انتہا پسندانہ ہندو نظریات سے متاثر مردوزن اہم عہدوں پر تعینات ہو چکے۔

یہ لوگ علی الاعلان یا چوری چھپے بی بے پی اور آرائیس ایس کے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں۔ انہی میں عدالتوں کے نجح اور وکیل بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے، 2014ء میں انتہا پسندوں کو دوبارہ اقتدار ملا تو عدالتیہ ان کی مرضی کے فیصلے سنانے لگی۔ مثلاً مساجد میں بھم دھاکے کرنے والے ہندو انتہا پسند رہا کر دیئے گئے۔ آسام میں نیشنل رجسٹر کی مہم چلانے کا حکم دیا۔ بابری مسجد کی جگہ رام مندر تعمیر کر ڈالا تھا کہ بھارت سپریم کورٹ کشمیر میں حکومتی ظلم و ستم روکنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکا۔ سچ یہ ہے کہ عدالتیں بھی انتہا پسندوں کے سامنے سرگوں ہو چکیں۔

بابری مسجد اور عدالتی فیصلہ

سپریم کورٹ نے تسلیم کیا کہ 1949ء میں بابری مسجد پر قبضہ نا جائز تھا۔ اسی طرح 1992ء میں مسجد غیر قانونی طور پر ڈھا دی گئی۔ اس کے باوجود اسے از سرنو تعمیر کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ یہ سراسر غلط اور نامنصافانہ فیصلہ تھا جس نے مسلمانوں ہی نہیں پوری بھارتی قوم کو نقضان پہنچایا۔ بابری مسجد 1528ء میں تعمیر ہوئی۔

وہ شرقی مغل فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ تھی۔ یہ مسجد کسی اور ملک میں ہوتی، تو حکومت بڑے اہتمام سے اس کی حفاظت کرتی۔ اسے تحفظ دینے کے لیے خاص اقدامات کیے جائے۔ مگر بھارت میں مذہبی جنونیوں نے دیوانہ وار اسے ڈھا دیا۔ ڈھانے کا عمل پورے دو دن جاری رہا اور بھارتی فوجی بھی غنڈوں کو نہ روک سکے۔ بابری مسجد شہید کرنے کا عمل کھلی غنڈہ گردی تھی۔ اگر سپریم کورٹ کے نجح انصاف پسند اور باضمیر ہوتے تو اس انہدام کو غیر قانونی قرار دے کر مسجد دوبارہ تعمیر کرنے کا حکم دیتے۔ مسجد کے نیچے سے کسی قدیم عمارت کی بنیادیں نکل بھی آئیں، تو یہ غیر متعلقہ معاملہ تھا۔ کیونکہ بابری مسجد شہید نہ ہوتی، تو یہ بنیادیں بھی برآمد نہیں ہو پاتیں۔ بھارت شاید دنیا کا اکلوتا ملک ہے جہاں پوری حکومتی مشیری نے غنڈوں اور بلوائیوں کے سامنے گھنٹے ٹیک دیئے اور ان کی مانگیں قبول کر لیں۔

فیصلہ علیٰ نقطہ نگاہ سے

سپریم کورٹ کے نجح تاریخ داں نہیں ہوتے۔ اور بابری مسجد کیس کے فیصلے سے عیاں ہے کہ وہ علم تاریخ پر بہت کم دسترس رکھتے ہیں۔ فیصلے نے تاریخ اور

افسانوی قصوں کو ”تاریخی حقائق“ کا نام دے کر بھارتی قوم پر ٹھوں رہی ہیں۔ مثلاً دریائے سرسوتی کا قصہ ہی لیجئے۔ ممکن ہے کہ اس قسم کا وسیع و عریض دریا پچاس لاکھ سال قبل بہتا ہو۔ مگر یہ کہنا کہ صحرائے تھر میں محض پانچ ہزار سال پہلے سرسوتی بہرہ تھا، یہ سراسر دیو مالائی قصہ اور تصوراتی بات ہے۔

دریائے سرسوتی کا جوہبہ

ہندو شدت پسند دریائے سرسوتی کی موجودگی ثابت کرنے پر بعند ہیں تاکہ اپنے نظریہ تاریخ کو درست ثابت کر سکیں..... یہ نظریہ کہ ہندوؤں خصوصاً برہمنوں کا نہایت شاندار ماضی رہا ہے۔ انہوں نے زبردست ایجادات کیں حتیٰ کہ پلاسٹک سرجی کا تختہ بنی نوع انسان کو عطا کر ڈالا۔ دراصل قدیم زمانے میں شمالی ہندوستان میں پہلے پہل بڑی انسانی بستیوں کی بنیاد پڑی۔ ان بستیوں کی تاریخ آج ”وادی سندھ کی تہذیب“ یا ”ہڑپہ تہذیب“ کہلاتی ہے۔ مگر شدت پسند ہندو لیڈروں کو یہ نام پسند نہیں کیونکہ دریائے سندھ پاکستان میں بہتا ہے۔ اسی طرح ہڑپہ بھی پاکستان میں واقع ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کو ”سرسوتی تہذیب“ کا نام دیا جائے۔ ان لیڈروں کا دعویٰ ہے کہ سندھ نہیں سرسوتی اس تہذیب کا مرکزی دریا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہو گی کہ جب بیجے پی نے پہلی بار (1999ء میں) حکومت سنہجاتی تو شدت پسندوں نے مکمل آثار قدیمہ سے ایک کتاب شائع کرائی۔ اس کتاب میں دعویٰ کیا گیا کہ دریائے سرسوتی پاکستان میں داخل نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ راجھستان میں ہی بہتا چلا جاتا۔ یہ ہے تاریخ منسخ کرنے کی عملی کوشش!

مہابھارت اور رامائن کی داستانیں

بھارت میں مہابھارت اور رامائن کی داستانیں آج بہت مشہور ہیں لیکن علم تاریخ کے لحاظ سے ان کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ یہ محض دیو مالا ہیں، خیالی قصے کہانیاں۔ ڈی سی سرکار مشہور بھارتی مورخ گزرے ہیں۔ وہ قدیم الواح پر نقش پڑھنے کے ماہر تھے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں رام چندر دیوتا نہیں ایک ہیرودی کی حیثیت رکھتا تھا۔ سنسکرت اور دیگر مقامی زبانوں میں بطور دیوتا رام چندر کا بہت کم ذکر ملتا ہے۔ تبدیلی اس وقت آئی جب نویں صدی کے بعد رامائن اور مہابھارت عوام میں مقبول ہونا شروع ہوئیں۔ ان کتب نے ہندوستانی عوام کو مذہبی طور پر کیجا کر دیا۔ تبھی ان داستانوں کے کردار دیوی دیوتاؤں کا درجہ قرار پا گئے۔ لیکن درحقیقت مہابھارت اور رامائن میں جو بھی کردار اور واقعات بیان ہوئے ہیں، ان کی کوئی اثریاتی شہادت موجود نہیں۔

بطور سچ بیان کیے جاتے رہے۔ کیا اب عدالتی فیصلے اسی انداز میں ہوں گے؟ تب تو بھارتی عدالیہ کا خدا ہی حافظہ ہے۔

سچ یہ ہے کہ یہ محض خیالی بات ہے، بابری مسجد کی جگہ شری رام نے جنم لیا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ ایودھیا کو رام کی جنم گاہ قرار دینا کوئی پرانا نظریہ نہیں۔ یہ دعویٰ سب سے پہلے اسکندر پر ان میں ملتا ہے۔ پروفیسر فیض نارائن جہا اور دیگر ماہرین تاریخ تسلیم کر چکے کہ اسکندر پر ان سولہویں صدی میں لکھا گیا۔ گویا تک بابری مسجد تعمیر ہو چکی تھی۔ مگر اسکندر پر ان میں بھی یہ ذکر موجود نہیں کہ رام جی کے جنم استھان پر مسجد بنائی جا چکی۔ اس میں صرف یہ درج ہے کہ شری رام ایودھیا میں پیدا ہوئے۔ یہ درج نہیں کہ ان کا جنم استھان بابری مسجد کے مقام پر واقع ہے۔ دور جدید کے شدت پسند ہندو لیڈروں نے مسلسل پروپیگنڈے سے اپنے ناخواندہ عوام کے ذہنوں میں یہ نظریہ جما دیا کہ بابری مسجد ہی رام جنم استھان ہے۔ یہ نظریہ اتنا رخ ہو چکا کہ سپریم کورٹ کے نجج بھی اسے رد نہ کر سکے۔ علم آثار قدیمہ میں ریڈ یاٹی کار بن اور دیگر سائنسی طریقوں سے جانا جاتا ہے کہ ایک شے کتنی پرانی ہے۔ مگر اب محض دیو مالا کی بنیاد پر فیصلے ہونے لگے تو کوئی سچا و کھرا ماہر آثار قدیمہ عدالت کا رخ نہیں کرے گا۔ وہاں جھوٹ بولنا اس کے نزدیک علمی بدبیانتی ہوگی۔

تاریخ اور دیو مالائی جھوٹ

علم تاریخ میں اثریاتی حقائق سامنے رکھ کر دلائل دیئے جاتے ہیں۔ اگر یہ بہت تھوڑے ہوں، تو تاریخ کو تھوڑے مروڑ کر پیش کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن دیانت دار مورخ کبھی اثریاتی حقائق کے برخلاف نہیں جاتا۔ مثال کے طور پر آر سی موجمداد مشہور تاریخ دا گزرے ہیں۔ یہ فرقہ پرست دانشور تھے۔ (موصوف ہی یہ نظریہ سامنے لائے کہ ہندوستان میں مسلمان اجنبی تھے۔ اسی لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کبھی ہم آہنگی اور دوستی پیدا نہیں ہو سکی)۔ 1970ء میں آر ایس ایس نے آرسی موجمداد پر دباؤ ڈال کر وہ تنظیم کے ترجمان رسالے، آر گناہر میں ایک خصوصی مضمون تحریر کریں۔

مضمون میں دعویٰ کیا جائے کہ بھارت میں جو آثار اور عمارتیں مغل بادشاہوں سے منسوب ہیں، وہ ان کی تعمیر کردہ نہیں بلکہ انہیں ہندو حکمرانوں نے تعمیر کرایا تھا۔ آرسی موجمداد نے یہ مضمون لکھنے سے انکار کر دیا۔ آر ایس ایس کے شدت پسند لیڈر بہت جذب ہوئے مگر موجمداد کا کہنا تھا کہ یہ دعویٰ کرنا علمی بدبیانتی ہو گی جسے وہ کبھی نہیں اپناتھکتے۔ آر ایس ایس اور دیگر انتہا پسند ہندو جماعتیں جھوٹ اور

بدها کو پوچنے والا۔ بہت سے ہندوستانی یہی وقت دو تین مذاہب کی پیروی کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد نے مقامی باشندوں کا طرز فکر بدل ڈالا۔ بت پرستوں نے دیکھا کہ مسلمان ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی اصول بھی معین و متین ہیں۔ چنانچہ بت پرستوں کے بعض لیڈروں میں اس خواہش نے جنم لیا کہ سمجھی مقامی باشندوں کو بھی ایک مذہب کے پلیٹ فارم پر جمع کر دیا جائے۔ اس طرح ہندو مت کی بنیاد پڑی۔ گویا نئے مذہب کی تخلیق میں مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ لیکن آج ہندو مت شدت پسند رہنمای اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تلواریں سونت کر کھڑے ہیں۔ یہ اسرار احسان نافراہموشی ہے۔

سیکولر ازم کی خلافت

آرائیں ایس طرز فکر سے منسلک تاریخ دنوں کا دعویٰ ہے کہ سیکولر ازم ہندوستان میں ایک اجنبی وغیر متعلق نظریہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جدید بھارت میں کیا چیز مقامی ہے؟ ہمارا آئین مغربی، پورا حکومتی ڈھانچا مغربی، صحافت مغربی، عدالتی مغربی، حتیٰ کہ ہمارے ملبوسات بھی مغربی ہو چکے۔ لہذا سیکولر ازم کو اجنبی قرار دینا بودی دلیل ہے۔ بر صغیر میں عوام سیکولر ازم کی اصطلاح کو سمجھ نہیں سکے۔ یہ نظریہ مذہب کا مخالف نہیں، بس مطالبہ کرتا ہے کہ حکومتی معاملات میں اسے داخل نہ کیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ حکومت کسی ایک مذہب کو ترجیح نہ دے بلکہ تمام معاملات میرٹ کے مطابق حل کرے۔ لیکن بھارت کے دوسرے صدر، رادھا کrishن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مذہب اور حکومت کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا رفتہ رفتہ بھارتی حکومت کے معاملات میں مذہب دخیل ہوتا گیا۔ اس چلن سے آرائیں ایس نے بھر پور فائدہ اٹھایا اور آخر کار اپنی مذہبی حکومت قائم کر لی جو مسلمانوں کی دشمن ہے۔

ہندو تہذیب کی قدامت

آرائیں ایس اور دیگر شدت پسند تنظیموں کا دعویٰ ہے کہ ہندو مت دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ وہ قدیم ترین تہذیب و ثقافت بھی رکھتا ہے۔ یہ تنظیمیں اس دعویٰ سے خبر و غرور کا اظہار کرتی ہیں لیکن تاریخی حقائق ان کا دعویٰ ثابت نہیں کرتے۔ ہندو مت کی قدیم ترین مذہبی کتاب ”رگ وید“ ہے۔ مناجات کی یہ کتاب 1500 قم سے 1000 قم کے مابین وجود میں آئی، گویا تین تا ساڑھے تین ہزار سال پہلے جبکہ رگ وید کا قدیم ترین مخطوطہ 1464ء میں لکھا گیا تھا۔ ماہرین کو قرآن مجید کے ایسے مخطوطے مل چکے جو 650ء میں لکھے گئے تھے۔ اگر ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اتنی ہی ترقی یافتہ تھی، تو وہ اپنی مذہبی کتابیں کیوں محفوظ نہ رکھ سکی؟ ہندو مت کی تمام مذہبی کتب کے مخطوطے طرز یادہ سے زیادہ ایک ہزار سال پرانے ہیں۔

بی جے پی کے بانیوں میں شیام پرشاد مکرجی اور دین دیال اپادھیائے شامل ہیں۔ جب بھی بی جے پی بر سر اقتدار آئے، تو ان دونوں رہنماؤں کی سالگردہ اور بر سیاہ سرکاری طور پر ترک و اختشام سے منائی جاتی ہیں۔ چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ تحریک آزادی ہندوستان میں دونوں رہنماؤں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اس کے باوجود بی جے پی انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ یہ دونوں رہنماؤں شدید متصہب اور فرقہ پرست تھے۔ 1941ء میں شیام پرشاد نے ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ”جو مسلمان ہندوستان میں نہیں رہنا چاہتے، وہ اپنا سامان اٹھائیں اور پاکستان چلے جائیں۔“ اس قسم کے لیڈروں نے آرائیں ایس کی نفرت انگیز پالیسی اور نظریات اپنا کر سیاسی پارٹی (بی جے پی) کی بنیاد رکھی۔ چونکہ بی جے پی کے پاس کوئی اور لیڈر نہیں، اسی لیے انہی دونوں کو اپنے اعلیٰ رہنمای تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

ہند تووا (ہندو شدت پسندی) کا نظریہ

یہ ایک فاشست نظریہ ہے۔ جب کسی ملک میں کوئی گروہ یا جماعت عوام میں مقبول ہونے کی خاطر قوم پسندی، نسل پرستی یا انتہا پسندانہ مذہبی نظریات کا سہارا لے، تو اسے فاشست کہا جائے گا۔ آرائیں ایس اور دیگر شدت پسند ہندو تنظیمیں فاشزم کے نظریات پر عمل پیرا ہیں۔ انہیں بھارت کے ایسے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی بھی حمایت حاصل ہے جو فاشست نظریوں پر یقین رکھتے ہیں۔ انہی کی حمایت پاکربی جے پی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

مقامات کا نام تبدیل

فاشست جماعتیں عوام میں مذہبی، نسلی، معاشرتی اختلافات پیدا کر کے پلتی بڑھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے، بی جے پی نے حکومت سنہجاتی تو وہ مختلف مقامات اور شہروں کے نام تبدیل کرنے لگی۔ جتنے بھی مسلم نام تھے، انہیں ہٹا کر کو ہندو و انہ نام دے دیئے گئے۔ یہ پالیسی اسی لیے اپنائی گئی تاکہ عوام میں مذہبی اختلافات ابھار کر اپنے مقادات حاصل کیے جاسکیں۔ نام تبدیل کرنے کی مہم ایک اور جہت بھی رکھتی ہے۔ اس طرح بھارت سے مسلمانوں کے دور حکومت کی نشانیاں ختم کرنا مقصود ہے۔ مدعا یہ ہے کہ آنے والی بھارتی نسلیں مسلم دور حکمرانی سے یکسر بے خبر ہوں۔ ورنہ مقامات کے نام تبدیل کرنا ایک مہنگا عمل ہے۔ سمجھی سرکاری کاغذات میں نئے نام لکھنے پڑتے ہیں۔ یوں عوام کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔

ہندو مت کیا ہے؟

ماضی کے ہندوستان میں مختلف بہت پرست گروہ آباد تھے۔ ان کے اپنے اپنے مخصوص دیوی اور مذہبی رسم و رواج تھے۔ کوئی شیوا کا پرستار تھا تو کوئی

سماجی سرگرمیوں کی خاطر بل گیئیں مائیکروسافت کے بورڈ سے مستعفی

انھوں نے یہ دولت پر شل کمپیوٹر کے لیے سافٹ ویر تیار کر کے حاصل کی ہے۔

نوجوانی میں وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر نیو میکسیکو کے شہر البارقی منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے اپنے بچپن کے دوست پال ایمن کے ساتھ مل کر مائیکروسافت کمپنی کی بنیاد رکھی۔ پال ایمن کا سنہ 2018 میں انتقال ہو گیا۔

ان کے لیے بڑی کامیابی اس وقت سامنے آئی جب انھوں نے معروف کمپیوٹر کمپنی آئی بی ایم کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے تحت انھوں نے آپرینگ سسٹم بنانے کا بیڑا اٹھایا جو کہ ایم ایس ڈاس کہلا یا۔

سنہ 1986 میں 31 سال کی عمر میں وہ دنیا کے سب سے کم عمر خود ساختہ ارب پتی بن گئے۔

بل گیئیں نے برک شائر کے بورڈ میں سنہ 2004 کے بعد سے اپنی خدمات فراہم کی ہیں لیکن اب وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے خیراتی ادارے بل اینڈ میلڈا گیئیں فاؤنڈیشن کے ساتھ گزارتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اسے قائم کیا تھا۔

کرانیکل آن فلینٹھر اپی نے سنہ 2018 میں ان دونوں کو دنیا کے سب سے زیادہ سُنی یعنی خیر کا کام کرنے والے افراد قرار دیا گیا تھا۔

انھوں نے اس سے قبل اپنے ادارے میں خیر کے کام کے لیے ۸۰.۴ ارب ڈالر کا عطا یہ دیا تھا۔



مائیکروسافت کمپنی کے شریک بانی بل گیئیں خیراتی کاموں کو زیادہ وقت دینے کی خاطر کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے مستعفی ہو گئے ہیں۔

انھوں نے کہا ہے کہ وہ عالمی سطح پر صحت اور ترقی، تعلیم اور ماحولیات کی تبدیلی سے منٹنے پر مزید تو جو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا کے امیر ترین افراد میں شمار ہونے والے 65 سالہ بل گیئیں نے دارین بفیٹ کی بڑی کمپنی برک شائر ہیئت وے کے بورڈ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے قبل سنہ 2008 میں وہ مائیکروسافت کے روزانہ کے اپنے کام سے بھی دستبردار ہو گئے تھے۔

لیکن انھوں نے کہا میں اس نے مرحلے کو ایک موقعے کے طور پر دیکھ رہا ہوں جس میں اپنی ان دوستیوں اور شراکت داری کو فتح مکمل رکھوں گا جو میرے لیے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں دونوں کمپنیوں کے ساتھ تعاون کرتا رہوں گا جن پر مجھے خڑ ہے اور میں دنیا کے مشکل ترین چیلنجز سے منٹنے کے موثر طریقے سے ترجیحات طے کروں گا۔

امریکی جریدے فور بزر کی دنیا کے ارب پتی افراد کی فہرست کے مطابق بل گیئیں 103.6 ارب امریکی ڈالر کی مجموعی مالیت کے ساتھ دنیا کے دوسرا امیر ترین شخص ہیں۔ اس فہرست میں پہلا نمبر ایمیزون کمپنی کے بانی جیف بیزوں کا ہے۔



کرونا وائرس کا علاج۔ سائنس سے کیا جائے یا مذہب سے؟

بشنکر یہ نیازمند

اس تناظر میں اب کرونا وائرس کے حوالے سے اسلامی جمہوریہ ایران میں بہت شدید ہو جانے والی موجودہ بحث یہ ہے کہ اس وائرس کا مقابلہ سائنسی تقاضوں کے مطابق کیا جائے یا پھر اس کے لیے مذہب اور عقیدے کو استعمال کیا جائے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ آج کے ایران میں ہونے والی یہ بحث انسانی تاریخ کی ایک بہت پرانی بحث ہے، جس میں مذہب روایتی طور پر سائنس اور سائنسی تقاضوں سے متصادم ہی رہا ہے۔

اس بحث کے بارے میں قم شہر سے تعلق رکھنے والے مذہبی علوم کے ماہر جنت الاسلام محسن الوری نے بتایا کہ اس موضوع پر ایرانی مذہبی قیادت تقسیم رائے کا

شکار ہے۔ انہوں نے کہا، ”یہ موضوع تو اسلام کے ابتدائی دنوں سے لے کر آج تک اسلامی فقہ کے ماہرین کے مابین اختلافات کا باعث بنا رہا ہے۔“

جنت الاسلام الوری کے الفاظ میں، ”کچھ لوگ مذہبی احکامات اور رسومات کو اعلیٰ ترین ترجیح دیتے ہیں، طب

ایران میں تیزی سے پھیلتا کرونا وائرس ایک نئی بحث کی وجہ بن گیا ہے، جس میں ایک بار پھر مذہب سائنس کے مقابل آگیا ہے۔ ملک کی مذہبی اور حکومتی قیادت میں بحث یہ ہے کہ اس مہلک وائرس کا مقابلہ مذہب سے کیا جائے یا سائنس سے؟

ملکی دارالحکومت تہران سے موصولہ رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ چینی صوبے ہوبے کے شہر ووهان سے شروع ہو کر اب تک دنیا کے تمام آباد براعظموں میں 60 سے زائد ممالک میں پھیل جانے والے کرونا وائرس سے چین کے بعد جو ممالک سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں، ان میں جنوبی کوریا کے ساتھ ساتھ ایران بھی شامل ہے۔

کرونا وائرس کی وجہ سے لگنے والی کووڈ انیس نامی بیماری کے نتیجے میں ایران میں اب تک 66 افراد ہلاک اور ڈیڑھ ہزار سے زائد متاثر ہو چکے ہیں، جن میں کئی وزراء، مذہبی رہنما اور ارکان پارلیمان بھی شامل ہیں۔

شیعہ مسلم اکثریتی آبادی والے ایران میں ریاستی ڈھانچے کی طرف سے عوامی اور سیاسی زندگی میں مذہب کو بہت زیادہ اور سائنس سے بھی زیادہ۔ لیکن کچھ لوگوں کے مطابق مقدار اگر کسی کی جان بچانا اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد سے ہو، تو نماز تک بھی، جو کہ لازمی ہے، چھوڑی جا سکتی ہے۔“

شیعہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر مقدس سمجھے جانے والے ایرانی شہر قم میں، جو ملک میں کرونا وائرس کی وبا کا مرکز بھی ہے، فاطمہ معصومہ کے مزار کے صدر سے بھی اوچا ہوتا ہے۔



انتظامی سربراہ کا نام آیت اللہ محمد سعیدی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اس وبا کے باوجود مذہبی مقامات پر عام لوگوں کو بلا روک ٹوک آمد و رفت کی آئندہ بھی اجازت ہونا چاہیے، ”اس لیے کہ مزار کوئی بھی ہو، وہ تو مقدس ہوتا ہے۔ جسمانی اور روحانی بیماریوں کی علاج گاہ، جہاں لوگوں کو آتے رہنا چاہیے۔“

مگر گزشتہ هفت قم شہر میں عوامی سلامتی کے لگران اعلیٰ تین ادارے کے سربراہ نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہاں مجتمع کی باجماعت نمازیں اس لیے منسوب کردی جانا چاہیے کہ یہ واہس مکنہ طور پر کسی ایک نمازی سے دوسرے کو نہ لگے۔ لیکن اس اعلان کے چند ہی گھنٹے بعد فاطمہ معصومہ کے مزار کی انتظامیہ کی ویب سائٹ پر یہ اعلان کر دیا گیا، ”جمع کی باجماعت نماز منسوب کرنے کا فیصلہ ایک غلطی تھا، جو ایمان کی کمزوری کی وجہ سے سرزد ہوئی“۔

گزشتہ بمحرات کو اس بحث میں ایران کے موجودہ سپریم لیڈر آیت اللہ علی خامنہ ای بھی اس وقت شامل ہو گئے، جب انہوں نے اپنے ایک بیان میں یہنے میں اس واہس پر قابو پانے کی کوششوں میں مذہب کے ساتھ ساتھ طی سامنہ کی بھی حمایت کی۔ خامنہ ای نے ایرانی ڈاکٹروں اور نرسوں کی کوششوں کو سراہت ہوئے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ان کی محنت سے ایران میں کورونا واہس کا جلد ہی خاتمه کر دیا جائے گا۔

یہی نہیں آیت اللہ علی خامنہ ای کے اس بیان کے مطابق قم شہر میں آیت اللہ عظمیٰ صافی گلپاگانی نامی انتہائی اہم مذہبی شخصیت نے بھی یہ فتویٰ جاری کر دیا تھا کہ عوام کو کورونا واہس سے بچاؤ کے لیے ملکی وزارت صحت کی سفارشات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

اس موقف کے بالکل بر عکس ایران میں ابھی حال ہی میں ایک ایسی ویڈیو بھی واہل ہو گئی، جس میں شیعہ مسلمانوں کے ایک ذیلی مذہبی گروپ کے ایک رکن کو مشہد میں امام رضا کے مزار پر دیکھا جا سکتا تھا۔ جعفر غفوری نامی یہ سرگرم سماجی شخصیت اس ویڈیو میں امام رضا کے روشنے کو اپنی زبان سے چاٹتے ہوئے دیکھی جا سکتی تھی اور ساتھ ہی جعفر غفوری نے یہ بھی کہا تھا، ”یہ دیکھو، میں یہ واہس لکھا رہا ہوں، تاکہ آپ کو یقین آجائے اور آپ بھی آئندہ اس مزار پر باقاعدگی سے آتے رہیں“۔

کو وہ اپیس نامی اس بیماری کے پھیلاؤ کے روکنے کے لیے مذہب پر زیادہ انحصار کیا جائے یا سائنس اور طبی سائنسی اصولوں پر، اس حوالے سے ایران میں جاری بحث فوری طور پر ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ واہس اب تک دنیا کے 60 سے زائد ممالک میں پھیل چکا ہے، اس کی وجہ سے تین ہزار سے زائد انسان ہلاک اور 90 ہزار سے زیادہ متاثر ہو چکے ہیں۔

ایران میں تا حال 66 انسانی ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ 1501 افراد کے مصدقہ طور پر اس واہس کا شکار ہو جانے کے باوجود، جب تک وہاں سائنسی تقاضوں اور عقیدے کے مابین تصادم جاری رہے گا، تب تک کورونا واہس کے خلاف جنگ بھی بھر پور طریقے سے نہ ٹڑی اور نہ ہی جیتی جا سکے گی۔



دیہا توں میں ایک کیڑا پایا جاتا ہے، جسے گوبر کا کیڑا (گونگٹ) کہا جاتا ہے۔ اسے گائے، بھیشوں کے گوبر کی بوہت پسند ہوتی ہے۔ وہ صبح انٹھ کر گوبر کی تلاش میں نکل پڑتا ہے اور سارا دن جہاں سے گوبر ملے، اس کا گولا بناتا رہتا ہے۔ شام تک اچھا خاصاً گولا بن جاتا ہے۔ پھر اس گولے کو دھکا دیتے ہوئے اپنی بل تک لے جاتا ہے۔ لیکن بل پر پہنچ کر اُسے احساس ہوتا ہے، کہ گولا تو بڑا بنا اور بل کا سوراخ چھوٹا ہے۔ بہت کوشش کے باوجود بھی گولا بل میں نہیں جا سکتا۔ اور وہ اسے وہی پر چھوڑ کے بل کے اندر چلا جاتا ہے۔ یہی حال ہمارا ہے ساری زندگی حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر دنیا کا مال و متعاق جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور جب آخری وقت قریب آتا ہے تو تو پتہ چلتا ہے کہ یہ سب تو ”قب“ میں ساتھ نہیں لے جاسکتے اور ہم اس زندگی بھر کی کمائی کو حسرت سے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔





سانحہ چھٹی سنگھ پورہ

کشمیر بھارتی ریاستی دہشتگردی

تحریر: انشال راؤ

ڈالیں۔

ایک انتہائی المناک اور بھارتی دہشتگردی کی کہانی آج سے بیس سال پہلے کشمیر کے ضلع آئندہ ناگ کے گاؤں چھٹی سنگھ پورہ کی ہے جب امریکی صدر میں کائنٹن کے دورے سے ایک دن پہلے بھارتی سرکار نے منصوبہ بندی کے تحت 36 بیناہ کشمیری سکھوں کو بلی کا بکرہ بنایا جس کا مقصد دنیا کی نظر میں کشمیری حریت پسندوں کو دہشتگرد کھانا تھا۔

بیس ماہ 2000ء کی شام بھارتی فوجی و ردی میں ملبوس افراد نے چھٹی سنگھ پورہ میں گوردوارہ سے عبادت کر کے لوٹنے والوں کو روکا اور پھر گھروں سے مرد حضرات کو شاخت پریڈ کے نام پر باہر نکال کر اپنے ساتھ لے گئے، خوش قسمتی سے اس سانچے میں نجح جانے والے ناک سنگھ کے بقول بھارتی دہشتگرد ان کو گوردوارہ سنگھ سہما سمندری ہال لے گئے جہاں ان کو لائیں میں کھڑا کر دیا اور ایک ہوائی فائر کیا جو کہ کوڈ ورڈ تھا وسری کمپنی کے لیے جس نے 17 بیناہ سکھوں کو شوقین محلہ گوردوارہ میں لائیں اپ کر رکھا تھا اور اس کے بعد ان پر سیدھی فائر نگ شروع کر دی، ناک سنگھ نیچے مجھ تھی طور پر گر گئے جسے کوئی بٹ نہ لگی لیکن باقی سب کو دس سے بارہ گولیاں لگیں، اس کے بعد بھارتی دہشتگردوں نے آگے آ کر تسلی کی کہ کوئی بچا تو نہیں ایک نے آواز دی

"ایک اور ماروسالوں کو، کوئی نجح نہ سکے"

پھر ایک ایک فائر اور کیا جس میں ایک گولی ناک سنگھ کی ٹانگ میں پیوست ہو گئی، ہر طرف خون کے فوارے پھوٹے ہوئے تھے، زخمیوں کے منہ سے آ ہوں اور سکیوں کی آوازیں نکل رہی تھیں، بقول ناگ سنگھ بھارتی دہشتگرد

"بچ شری رام، بچ ماتا کی، بھارت ماتا کی بچ"

نعرے لگاتے ہوئے چلے گئے، جب گاؤں والے وہاں پہنچے تو قیامت کا منتظر تھا ان کی دنیا ہی لٹ پھی تھی، ہر آنکھ اشکبار تھی، گھر گھر ماتم اور چیخ و پکار تھی، پورے چھٹی سنگھ پورہ میں ایک گاڑی بھی نہیں تھی جو کسی زخمی کو ہسپتال لے جاتے، بہت سے زخمیوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی، کچھ ہی منٹوں میں 36 گھرانے اُجز گئے، جہاں ایک طرف تو سکھ برادری غمگین تھی تو وہیں بھارتی سورما سکھوں کے خون سے ہولی کھیل کر مسحور ہو رہے تھے اور بل کائنٹن کے دورے کے موقع پر اس سانچے کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے تھے۔

جنت ارضی کشمیر کی پہچان تو حسین وادیاں، بلند و بالا پہاڑ، برف پوش پہاڑوں سے نکلتے پانی کے چشمے، پھلوں اور پھلوں سے لدے درختوں پر مشتمل باغات اور ان میں چچھاتے رنگ برنگے پرندے، سرسبز و شاداب کھیت کھلیاں ہیں لیکن کشمیر کا ذکر آتے ہی زہن میں جو تصور آتا ہے اس میں معصوم پھلوں کی چینیں، جوان بیٹوں کی لاشوں اور جوان بیٹوں کی عصمت دری پر ماں کی سکیاں سامنے آتی ہیں، ہزاروں خواتین کے چہروں کی بیروقنی بتاتی ہے کہ شوہروں کے جیتے جی وہ بیوہ بن کر جینے پر مجبور ہیں کیونکہ ہزاروں بیناہ کشمیری بھارتی جیلوں میں قید ہیں اور ہزاروں لاپتہ ہیں جن کے انتظار میں بیٹھی بہت سی غمگین ماں کیں اس دنیا سے ہی چلی گئیں بہت سی ماں کے آنسو، ہی خشک ہو گئے ان کی جگہ آنکھوں سے خون رستا ہے، لاکھوں مجبور اڑکیوں کی ویران آنکھیں ان پر بھارتی فوجی کیمپس میں بیتی المناک کہانیاں سناتی ہیں۔

دہائیوں سے جوان بیٹوں کے لاثے اٹھا اٹھا کروادی کشمیر کی حسین وادیوں سے درد والم کے گہرے دھویں اٹھتے دکھائی دیتے ہیں اگر کشمیر کی زبان ہوتی تو وہ اپنادھکیوں بیان کرتا تھا

"صرف لاثے ہی لاثے میری گود میں، کوئی پوچھے میں کیوں اتنا غمگین ہوں" لیکن دنیا کے یہیں سکھ مردان سیاسی و معاشری مفادات کی بنا پر بھارتی ظلم و بربریت پر مجرمانہ طور پر آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں، انسانی حقوق اور عالمی قوانین کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے مودی انتظامیہ نے کشمیر کو غاصبانہ طور پر بھارت میں شامل کیا جو کہ اقوام متحده کی درجنوں قراردادوں کی صریحاً خلاف ورزی ہے لیکن انسانی حقوق کے چیمپئن سیاسی و معاشری مفادات کی وجہ سے اسے بھارت کا اندر ونی مسئلہ ہونے کا تاثر دیتے رہے، آٹھ ملین سے زائد مظلوم کشمیری قید کر لیے گئے مہینوں سے کشمیر میں بھارتی ظالماںہ لاک ڈان رہا دنیا خاموش رہی آج قدرت نے ان تمام ریاستوں جو معاشری مارکیٹ کی وجہ سے بھارتی سفا کیت پر سادھے ہوئے تھے ان کی معيشت ان ہی کے ہاتھوں تھس نہیں کر دی، قدرت والے نے آزاد ہوتے ہوئے ان ریاستوں کو قید ہو کر جینے پر مجبور کر دیا۔

کشمیر کی گھٹتی ہوئی بستیاں اور بڑھتے قبرستان دنیا کے یہیں سکھ مردانوں کے ضمیر چھپ جھوڑ رہے ہیں جن میں ایسی ایسی سفا کیت کی کہانیاں دفن ہیں کہ سینے چیر

انٹرنشنل کرمنل کورٹ میں لایا جائے تاکہ بیگام بھیریوں کو نجٹھ ڈالی جاسکے۔



جب آپ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنا شروع کرتے ہیں حتیٰ کہ معمول بنا لیتے ہیں روزانہ ایک پارہ یا اس سے کم زیادہ۔ پھر آپ مقدار بڑھادیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بڑھاتے جاتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ قرآن بھی آپ سے دوستی کر لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بخود قرآن پڑھنے کی طرف دل مائل ہوتا ہے اور کام سارے آسان ہو جاتے ہیں۔ تاکہ تلاوت کا وقت مل سکے۔ پھر جب قرآن آپ سے دوستی کر لیتا ہے تو تلاوت شروع کرتے ہی آپ کے دل کی تاریخ قرآنی حروف سے جڑ جاتی ہیں اور لفظوں کا انتار چڑھا گویا آپ کی روح کا لطف ہوتا ہے۔ قرآن جب کسی سے دوستی کرتا ہے پھر زندگی بھر دوستی نبھاتا ہے۔ بلکہ قبر کا ساتھ بھی ہے۔

بعضوں نے لکھا ہے کہ حشر میں بھی ساتھ ہو گا حتیٰ کہ قرآن تناوفا دار ہے کہ اپنے دوست کو جنت میں داخل کر کے ہی چھوڑے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن مجید کی تلاوت روزانہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور تلاوت کے ساتھ قرآنی آیات و احکامات پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ قرآن مجید کی عظمت اور محبت ہم سب کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہے۔ اللهم آمين۔

بھارتی وزیر اعظم واجپائی صاحب نے واقعہ کا زمہ دار اشکر طیبہ اور حزب المجاہدین کو قرار دیتے ہوئے پاکستان پر الزام لگایا، اس دخراش سانحے کے پانچ دن بعد بیگام بھارتی دہشتگرد فوج نے پتھریبل میں پانچ معصوم سویلیں کو جعلی مقابله میں قتل کر دیا جن کو سکھ جینوسائڈ چی سنگھ پورہ کے کردار بتایا گیا اور شناخت پاکستانی دہشتگرد بتائی گئی لیکن یہ جھوٹ جلد ہی سامنے آ گیا جب ان کے لواحقین احتجاج پر نکل آئے تو پتہ چلا کہ وہ دہشتگرد نہیں بلکہ عام بیگناہ سویلیں تھے اور یہ مقابله بھی جعلی مقابله تھا لیکن افسوس ثابت ہونے کے باوجود جعلی مقابله میں معصوم شہریوں کے قتل میں ملوث فوجی افسران کو سزا سے استثناء قرار دیدیا گیا، بھارتی فوج کی ڈھٹائی کا یہ عالم تھا کہ DNA کے لیے بھیج جانے والے سیپل پانچوں خواتین کے نکلے جبکہ مقابله میں مارے جانے والے مرد کشمیری شہری تھے۔

2017ء میں لیفٹینٹ جزل (ر) کے ایس گل نے جنلس جسنسیت سنگھ کو اثر یو دیتے ہوئے اکشاف کیا چی سنگھ پورہ میں سکھوں کے قتل عام میں بھارتی فوج ملوث تھی اور پتھریبل جعلی مقابله میں بھی بھارتی فوج کا ہاتھ تھا جسکی رپورٹ یونین منٹریال کے ایڈوانی کو پیش کی گئی تھی اور مقصد پاکستان و حریت پسندوں کو بدنام کرنا تھا، بلکہ نہیں نہیں اس وقت کہا تھا کہ "افسوس اس کی وجہ سے بہت سی جانیں گئیں"

لیکن افسوس اصلیت سامنے آنے کے باوجود امریکہ نے بھارت کو گام نہ دیا جس کے بعد ایسی سینکڑوں نہیں ہزاروں جانیں بھارتی ظلم و جبر کی چکی میں پس گئیں، پلامہ حملہ بھی ایسی ہی ایک سازش تھی جسے الہیان مغرب نے فقط اپنے اسلاموفویا کے مرض کا شکار ہونے کی وجہ سے تسلیم کر لیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھارتی ایجننسی را کار چایا ہوا ناکام منصوبہ تھا۔

سانحہ چی سنگھ پورہ، پتھریبل جعلی مقابله جیسی بہت سی مثالیں ریکارڈ پر موجود ہیں ہزاروں نہیں لاکھوں لوکل کشمیری بھارتی مکاری کے عین شاہد ہیں کہ کشمیر میں بھارتی فوج کی دہشتگردی کا نگاہناچ لگائے بیٹھی ہے اور ایسے جھوٹے ہتھکنڈے استعمال کر کے الزام پاکستان پر لگادیتے ہیں، ٹلسی گورڈ جیسی بہت سی ایسی آسامیاں ہیں جنکو بھارتی ریاست اور ہندو ڈاؤ دہشتگردوں نے فناش و سپورٹ کر کے بیرون ممالک میں بھارتی پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، نام نہاد انسانی حقوق کی علمبردار ٹلسی گورڈ ہلی میں ریاستی سرپرستی میں مسلم جینوسائڈ پر حرفا تک نہ کہا جس کے بعد اس کی مقر وہ اصلیت دنیا کے سامنے آگئی ہے۔

سانحہ چی سنگھ پورہ کے متاثرین کی طرح لاکھوں افراد بھارتی دہشتگرد فوج اور ہندو ڈاؤ دہشتگردوں کی ظلم و بربریت پر آج بھی انصاف کے منتظر ہیں جس کا بھارتی ریاست و عدالتی سے ملتا تو نامکن ہے اب لازم ہے کہ بھارتی دہشتگردی کا مقدمہ



آسٹریلیا کے سکولوں میں 200 سال سے جاری

مذہبی تقریروں کا خاتمه: منظر و پس منظر

تحریر: ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا

پر مشتمل تھی اور وہ "جھگلی سکول" (Hut School) کہلاتا تھا۔ 1880ء میں جب ہر ایک لئے رسمی تعلیم قانوناً لازمی قرار دے دی گئی تو پبلک یعنی سرکاری سکولوں کے قیام کی بھی ابتداء کر دی گئی۔ تاہم ان سکولوں میں چرچ سے مسلک کم از کم ایک چیپلین کی تقریری لازمی قرار دی گئی جسے حکومت کی طرف سے اب تک تجوہ ملا کرتی تھی۔

نئے قانون کے تحت گوکہ نصاب تعلیم کو سیکولر کھا گیا تھا لیکن سکولوں میں مذہبی تعلیمات کی روزانہ کلاس ٹائم ٹیبل میں شامل رکھی گئی تھی۔ اس کا مقصد طالب علموں کی اخلاقی، ذہنی اور روحانی نشوونما تھی تاکہ وہ ایک اچھا شہری بن سکیں۔

واضح رہے کہ آسٹریلیا کے اولین سفید فام آباد کاروں کی اکثریت ان سڑاکیوں کی تعداد میں ایسے نہیں برطانیہ کی جیلوں میں جگہ کم پڑ جانے کی وجہ سے یہاں لایا گیا تھا۔ ان کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لئے دینی تعلیمات کا سہارا لیا گیا۔ ان افراد کی ایک خاصی تعداد کو محض افلاس کی وجہ سے مجبور ہو کر چھوٹے موٹے جرائم کے ارتکاب، مثلاً ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا، دودھ کی بوتل، کمی کا چھٹا، روماں یا جوتوی وغیرہ چوری کرنے پر بھی جیل کی سزا نہیں سنادی گئی تھیں۔

سینکڑوں کی تعداد میں ایسے نہیں منے برطانوی بچے بھی بھری جہازوں میں بھر بھر کر یہاں لائے گئے جن کی کفالت ان کے والدین یا حکومت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بچے زندگی بھر برطانیہ واپس نہیں جاسکے۔ اکثر کو ان کے آبائی شہروں حتیٰ کہ والدین تک کا نام بھی یاد نہ رہا، اور نہ ہی انہیں بتایا گیا۔ نہ بادیاتی آسٹریلیا کے ابتدائی دوڑھائی سو سال کی سفید فام آبادی انہی اسیر جلاوطنوں اور ان کی اولادوں اور یا پھر عوائد میں حکومت اور ملازم میں پر مشتمل رہی۔

اس ماحول میں عیسائی مشرنی اور سکول چیپلین ان افراد کو دلasse دیتے، ان کی اشک ثوئی کرتے اور ہمت بڑھاتے۔ نیتھاً ہر سکول میں، خواہ وہ پرائیویٹ تھا یا پبلک، ایک عدد چیپلین کی تقریری ناگزیر ہو گئی اور یہ عمل روایتی طور پر آج تک

گزشتہ برس یعنی 2019ء کے اختتام سے پہلے پہلے آسٹریلیا کے دارالحکومت کینبرا کے تمام سرکاری سکولوں میں مذہبی مددگاروں کی روایتی تعینات کا نظام ختم کر دیا گیا۔

اس سے چند سال پیشتر آسٹریلیا کی ریاست و کشوریہ میں بھی اسی قسم کے اقدامات کا نفاذ کر دیا گیا تھا۔ دیگر ریاستیں بھی اس ضمن میں قانون سازی کا سوچ رہی ہیں۔

ان مددگاروں کو سکول چیپلین (Chaplain) کہا جاتا ہے۔ ان کا کام رسمی درس و تدریس نہیں ہوتا، یہ خصل طلباء و طالبات کی اخلاقی، نفسیاتی اور معاشرتی غمہداشت، فلاج و بہبود اور انہیں لاحق کسی بھی قسم کے غیر نصابی مسائل میں چارہ گری، رہنمائی اور رہبری یعنی کونسلنگ سروس فراہم کرتے ہیں۔

سکول چیپلین پر یہ پابندی عائد کی جاتی ہے کہ وہ طلباء کو کسی مخصوص مسلک یا مذہب کی تبلیغ یا ترغیب نہیں دیں گے تاہم ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ کسی چرچ سے سند یافتہ اور مسلک ہوں۔ اصولی اور قانونی طور پر چیپلین مسیحی، مسلمان، یہودی، بدھ، یا ہندو وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن تاریخی طور پر عموماً مسیحی ہی ہوتے ہیں۔

سکولوں کے علاوہ ہسپتاں اور عسکری اداروں میں بھی چیپلین تعینات کئے جاتے ہیں۔

آسٹریلیا جب نیانیا برطانوی نوآبادی بناتے تو حکومت کے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ یہاں تعلیمی ادارے قائم کر سکے۔ اس بات کا سہرا ابتدائی عیسائی مشنریوں کے سرہی جاتا ہے جنہوں نے آسٹریلیا میں بچوں کے لئے سکول کالج اور ہوٹل وغیرہ قائم کئے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا کریچیئن مشن سکول 1797ء میں ایک پادری ریورنڈ رچڈ جانس نے قائم کیا جو نیو ساٹھ ویز حکومت کے لئے بطور چیپلین کام کرتا تھا۔ اس سے قبل وہ سڈنی میں قائم کردہ ایک ایسے سکول کی نگرانی پر مامور تھا جس کی عمارت محض ایک جھونپڑی مائنہ نامہ لاہور انٹرنشنل جمادی الاول 1441 اپریل 2020ء

اسی طرح سے چلا آ رہا تھا۔

چپلین کا تقریر یاد نئی تعلیم کا پیر یڈ سکولوں کے ٹائم ٹیبل میں شامل کرنا گویا آئین اور قانون کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ جو چپلین اس وقت خدمات بجا رہے ہیں، انہیں اس صورت میں دوبارہ ملازمت لے گی اگر وہ چاند سایکا لو جی یا سو شل ورک کا ڈپلومہ وغیرہ حاصل کر لیں۔ چرچ کی جاری کردہ سنداب قابل قبول نہ ہوگی۔

ریاست و کٹوری (دارالحکومت میلوون) کی حکومت نے یہ توجیہہ بھی بیان کی کہ طلباء کو دینیات کا درس دینے کی بجائے یہ تعلیم دی جانے کی ضرورت ہے کہ وہ آج کے معاشرہ میں روزافزوں ڈیمیٹک والنس یعنی خانگی تشدد کے واقعات کی کیسے روک تھام کر سکتے ہیں۔ انہیں کسی مخصوص مذہب کی تعلیم دینے کی بجائے دنیا میں موجود مذاہب عالم کے بارہ میں آگاہی پہنچائی جائے اور معاشرہ میں موجود مختلف مذہبی یا فکری نظریات کے حامل افراد کے ساتھ باہمی عزت کے برداشت کرنا سکھایا جائے۔ اسی طرح انہیں معاشرتی علوم اور شہریت پڑھائی جائے گی تاکہ وہ اپنے شہری بن سکیں۔

کرچین، جیوش اور اسلامک ایجوکیشن سکولوں کے لئے پہلے سے یہ پابندی عائد ہے کہ وہ طلباء کو روزانہ تیس منٹ سے زائد دینی علوم نہیں پڑھ سکتے۔ ان کا بقیہ سارا ٹائم ٹیبل اور نصاب وہی ہوگا جو سرکاری یا پرائیویٹ سکولوں کا ہوتا ہے۔ تاہم انہیں اپنے خرچ پر سکول میں چپلین، ربی یا امام کی تقری کی اجازت ہو گی۔ مزید دینی تعلیم کے لئے چرچ یا مسجد میں اتوار کلاس منعقد کی جاسکتی ہے۔ تیرے یہ کہ حکومتی بجٹ چپلین نظام کا باراٹھانے کی متحمل نہیں رہا۔

چوتھے یہ کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے سیکولر جماعتیں اور رسول سوسائٹی کے متعدد گروپ مسلسل حکومتوں سے یہ مطالبہ کرتے چلے آ رہے تھے کہ آسٹریلیا کا سیکولر شخص قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے چپلین نظام کو ختم کرنا ضروری ہے جس میں مذہبی اداروں سے وابستہ افراد کی تقری کی جاتی ہے۔ ملک کی تین بڑی سیاسی جماعتیں ہر ایکشن میں ملک کے سیکولر طبقہ کے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر اس اقدام کا وعدہ کرتی چلی آ رہی تھیں لیکن اس پر آج تک عمل نہ ہو سکا تھا۔ موجودہ حکومت نے اس کام کی ابتدا دار الحکومت کینبرا سے کر دی ہے۔

لیکن پانچویں وجہ جو رائم کے نزدیک سب سے زیادہ اہم اور معنی خیز ہے وہ ایک ایجنٹلیکن مشنری ٹیچر اور مصنف ڈاکٹر ماٹیک بڑی کی بیان کردہ ہے۔ آپ ماضی میں آسٹریلیا آرمی کے چپلین رہ چکے ہیں۔ آسٹریلیا نشیانی ادارہ اے

ضمی طور پر یہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا بچوں نے بڑے ہو کر اور ان کے بعد ان کی اولادوں نے دولت مشترکہ (کامن ولیٹھ) کے خلاف "اغوا بالجر" کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے، جس میں انہیں کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔ حکومت کے خلاف اغوا بالجر کے ایک اور مقدمے میں وہ مدعاں بھی شامل ہیں جو سفید فام مردوں اور مقامی سیاہ فام ایجوکیشن عورتوں کے اختلاط سے پیدا ہوئے تھے، اور جنہیں محض اس وجہ سے ان کی مقامی ماوں سے زبردستی جدا کر کے حکومتی تحويل میں لے لیا گیا تھا کہ ان کی رگوں میں سفید فام باپ کا خون گردش کر رہا تھا، چاہے ان کی جلد کارنگ کیسا بھی ہو اور بعض کیسز میں تو باوجود یہ انہیں اپنے سفید فام باپ کی سرپرستی اور کفالت بھی حاصل تھی، حکومتی تحويل میں لے لیا گیا۔

مذکورہ بالا ہر دو قسم کے مدعاں کو اصطلاحاً مسر و قہ نسلیں یعنی سٹولن جزیش The stolen Generations کہا جاتا ہے۔ رقم کو ہر دونسلوں سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد سے ان کی کہانیاں سننے کا موقع ملا ہے۔ اس قسم کے رنج غم، احساس شانتگی و پامالی، عنیض و غصب، یاس و حسرت، بے چینی و اضطراب کے ملے جملے جذبات کو موروٹی اور شعوری طور پر نسل درسل منتقل ہوتے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آدم برس مطلب، یہ اچانک ایسا کیا ہوا کہ آسٹریلیا کے پبلک سکولوں میں کم و بیش دوسو برس سے چلتے آ رہے چپلین کی تقریبیں کوئی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا؟۔ اس کی متعدد جوہات بتائی جاتی ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ جدید آسٹریلیا میں اب پیشہ و راو رتہ بیت یافتہ سو شل ورک اور ماہرین نفسیات تیار ہونے لگ گئے ہیں جو جدید ترین خطوط پر بالخصوص بچوں اور نو عمر جوانوں کو کونسلنگ سروس بھم پہنچا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے کسی مذہبی ادارے سے سند یافتہ ہونا یا مذہبی تعلیمات کا حوالہ دینا ضروری نہیں رہا۔ بہت سے سکولوں میں سکول سایکا لو جسٹ کی آسامیاں پیدا کر کے وہاں چاند سایکا لو جسٹ یعنی بچوں کے ماہرین نفسیات کی کل وقت خدمات بھی دستیاب کر دی گئی ہیں۔

دوسرے یہ کہ حکومت کا کہنا ہے کہ چونکہ آئینی اور قانونی طور پر آسٹریلیا ایک سیکولر ملک ہے اور اس کا درسی نصاب بھی روزاول سے سیکولر قرار دیا گیا تھا تو

بی سی کو بھیجے گئے اپنے مکتب میں، جو 23 ستمبر 2015 کو شائع ہوا، ریاست و کشوریہ کے مذکورہ بالا حکومتی اقدامات پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے ان قدمات کو آسٹریلیا کے سیکولر طبقات میں بڑھتے ہوئے "عدم برداشت کار بجان" قرار دیا ہے۔

آسٹریلیا میں سیکولر ازم کی تاریخ کے مختلف ادوار اور اس کے ارتقا کا تجزیہ کرتے ہوئے آپ کا کہنا ہے کہ لگ بھگ ڈیڑھ دوسال میں آسٹریلیا میں سیکولر ازم جو پہلے خاصاً بدل اور ہلکا ہلکا ہوتا تھا، مہبی اداروں اور ان سے تعلق رکھنے والے افراد کے کردار اور افعال کی وجہ سے آہستہ آہستہ غیر پکدار بلکہ جارحانہ ہو چکا ہے۔ گزشتہ چند ہائیوں میں ایک طرف پادریوں کے گھاؤنے جنسی جرائم (جو سوال سے بھی زائد عرصہ سے جاری تھے) کے بے نقاب ہونے اور پھر اسلام سے وابستہ کچھ افراد اور تنظیموں کی طرف سے دہشت گردی کی وارداتوں نے سیکولر طبقہ کو اس حد تک بھٹا دیا کہ اب مذہب کا نام سنتے ہی ان کے ذہن میں یا تو ب فعل (پیڈ و فائل) پادری آجاتے ہیں اور یا دہشت گرد جہادی۔

بے شک انسان کمزور اور خطلا کا پتلا واقع ہوا ہے اور یہ کہ انبیاء کے علاوہ کوئی بھی معصوم عن الخطاء نہیں ہوتا لیکن اگر خود کو بظاہر بڑا مذہبی اور مخلص ظاہر کرنے والا کوئی فرد باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے ایسے گھاؤنے جرام کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر کرتا ہی چلا جاتا ہے، جس کی زد میں دوسرے افراد آتے ہوں تو یاد رکھئے کہ دنیا و آخرت میں تو خیر سزا ملے گی ہی لیکن ایسا فرد وسیوں، بیسوں، سینتوں بلکہ لکھوکھا افراد کو دین و مذہب سے تنفس کرنے مجب مذہب کا دشمن بنانے یا ہزاروں لاکھوں کمزور ایمان والوں کے لئے ٹھوکرا موجب بننے کا گناہ بھی مول لے سکتا ہے۔

روایت مشہور ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایک بچے کو بارش اور کچھ میں دوڑتے بھاگتے دیکھ کر تنہیہ کی کہ دیکھو بچے کہیں پھسل کر گرنہ جاؤ، تو اس نے بے ساختہ کہا کہ امام صاحب میری فکر نہ کیجئے، اگر میں پھسلا تو میرا ہی نقصان ہو گا، لیکن اگر آپ پھسل گئے تو یہ ساری امت کا نقصان ہو گا۔ کیسی پیاری ذمیتی اور گھری بات ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ثبات قدم عطا فرمائے اور پھسلنے سے بچائے، آمین۔



چھپلیں کی موجودگی نہ صرف سیکولر طبقات بلکہ پھوؤں اور ان کے والدین اور پھر حکومت کے لئے بھی اضطراب کا باعث بننا شروع ہو گئی تھی۔ آسٹریلیا کے مذہبی ادارے اور ان کی پیشوائیت خود کو مغلکوں بنا چکی ہے جس کا نتیجہ مذکورہ بالا حکومتی اقدامات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

قارئین کرام مؤخر الذکر وجہ واقعی سب سے اہم اور فکر انگیز ہے۔ آسٹریلیا میں سوسائٹی بالعموم مذہب سے نہیں بلکہ مذہب والوں کی منافقت اور دو غلے پن کی وجہ سے مذہب سے تنفس ہو چکی ہے۔ ایسے میں سیکولر ازم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پہلے سے کہیں بڑھ کر ذہنوں میں اج�گر ہوا ہے۔

چھاں تک آسٹریلیا میں نابالغوں کے ریپ کا تعلق ہے تو یہ محض پادری یا ملا تک محدود نہیں۔ حال ہی میں ایک یہودی پرنسپل بلکہ لیفر کا سینڈل منظر عام پر آیا ہے۔ جو مبینہ طور پر گزشتہ ایک دہائی سے میلیوں میں واقع ایک یہودی درس گاہ اور ہوٹل میں یہودی بچوں اور بچیوں کا جنسی استھان کرتی رہی۔ پولیس نے تعقیش شروع کی تو وہ فرار ہو کر اسرائیل جا پہنچی لیکن وہاں گرفتار کر لی گئی۔

اسی طرح حال ہی میں پادریوں کی جنسی زیادتیوں کی تعقیش کرنے والے رائل



ہندو مسلم فسادات، وہی قاتل وہی منصف

تحریر: افتخار گیلانی

کو عدالت کے کٹھرے میں لا کر سزا دی گئی ہو۔ میں نے اپنے جرنلزم کیر پر کی ابتدا ہی ایک ہندو۔ مسلم فساد کو کرنے سے کیا۔ نوے کی دہائی کے اوائل میں دہلی کے وسط میں نظام الدین کے علاقہ میں ہندو۔ مسلم فساد پھوٹ پڑے تھے۔ میں ایک نیوز و فیچر ایجنسی میں بطور انترن کام کر رہا تھا۔ حکم ہوا کہ فساد کو کرنے کیلئے اپنے ایک سینئر کا ساتھ دینے کیلئے اس علاقہ کی طرف کوچ کروں۔ اس علاقہ میں ایک نالہ مسلم اور ہندو علاقوں کو جدا کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اور چار افراد پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ پر میں کا کارڈ چیک کر کے پولیس والے آگے جانے دے رہے تھے۔ مسلم علاقوں سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ تیلینی جماعت کی بنگلہ والی مسجد اور مزار غالب کے سامنے والی سڑک پر تازہ خون کے نشانات تھے۔ درگاہ حضرت نظام الدین، امیر خسرہ، عبد الرحیم خان خانا، مغل بادشاہ ہمایوں کی آرام گاہوں کی شکل میں مسلمانوں کی شان و شوکت کی علامت یہ علاقہ کسپری کی دہائی دے رہا تھا۔

درگاہ کی طرف جانے والے راستہ پر مکانوں کی ادھ کھلی کھڑکیوں کے پیچے خوف و ہراس سے پر آنکھیں ہمیں تک رہی تھیں۔ بستی کے اطراف وقف کی خاصی زیں ہے، جس پر قبرستان، کئی مساجد اور درگاہ ہیں موجود ہیں۔ چونکہ بستی کے ہندو مکینوں کو مردے جلانے کیلئے خاصی دور دریائے جمنا کے کنارے جانا پڑتا تھا، اسلئے کئی دہائی قبل درگاہ کے سجادہ نشین پیر ضامن نظامی نے نالے سے متصل ایک قطعہ ہندوؤں کو شمشان کیلئے عطا یہ کیا تھا۔

اب ویش ہندو پریشد اور دیگر ہندو تنظیمیں اس قطعے میں نالے کے اس پار قبرستان کی وسیع و عریض اراضی شامل کر کے اس کی حد بندی کر کے اسپر عمارت بن رہی تھی۔ جس پر مسلمانوں کے اعتراض کی وجہ سے فساد پھوٹ پڑا تھا۔ فساد پھٹشم خود کیخنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ نالہ کو پار کر کے دیکھا کہ کرفیو کی دھیجان اڑیں ہوئی تھیں۔ ایک جم غیر پولیس کی بھاری موجودگی میں نالے کے دوسرا طرف

بھارت میں فرقہ وار ائمہ فسادات کا براہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق 1947ء میں آزادی کے بعد سے پہلے 73 سالوں میں ملک کے طول و عرض میں 58400 فسادات پھوٹ پڑے ہیں۔ بڑے فسادات جہاں 50 یا اس سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے کی تعداد لگ بھگ 110 کے قریب ہے۔ نیشنل کرامہ ریکارڈ بیورو کے مطابق 2008ء سے 2018ء کے دس سالوں کے وقفہ کے درمیان کم و بیش 8 ہزار فسادات ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ یعنی ایک طرح سے ملک میں ہر روز دو فسادات ہوئے ہیں۔

ان سمجھی فسادات میں پولیس کا رول حالیہ دہلی میں رو نما ہوئے فسادات کی طرح ہمیشہ سے ہی جانبدارانہ رہا ہے۔ بجائے فسادات کو کنٹرول کرنے والے بلوائیوں کا ساتھ دیکر مسلمانوں کو نشانہ بناتے ہیں یا بس خاموش تماشائی بن جاتے ہیں۔ بقول ایک سابق سینئر پولیس افسرو بھوتی نارائیں رائے، جنہوں نے 1989ء میں اتر پردیش کے میرٹھ شہر میں ہاشم پورہ اور ملیانہ قتل عام کی ابتدائی تحقیقات کی تھی، بھارت میں پولیس اور مسلمانوں کا رشتہ ہمیشہ سے ہی معاندانہ رہا ہے۔ فسادات پر رائے نے کئی تحقیقی مقاولے لکھے ہیں۔

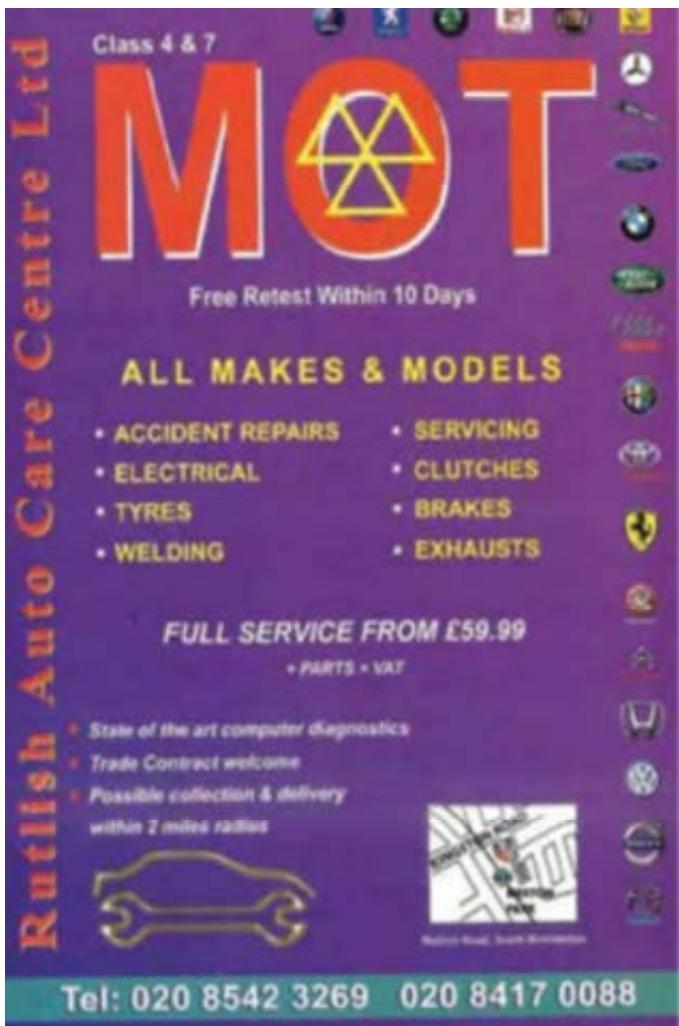
بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہوئے فسادات کے تناظر میں ہندی زبان میں ان کی ناول، شہر میں کرفیو، خاصی مشہور ہو گئی تھی۔ ان کی تحقیق کے مطابق مسلمان فسادات کے دوران پولیس کو شمن سمجھتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے جہاں مسلمانوں کو ہی فسادات میں اکثر بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، وہ پولیس کے تھر کا نشانہ بھی بن جاتے ہیں۔ فسادات سے نپٹنے کے نام پر ان کے ہی نوجوانوں کو پولیس حرast میں لیتی ہے۔ پھر فسادیوں کے ساتھ تصفیہ کروا کے رہا کرتا ہے۔

1984ء کے دہلی کے سکھ خالف اور 2002ء کے گجرات کے مسلم خالف فسادات کے علاوہ شاید ہی کبھی فساد برپا کرنے والے بلوائیوں یا ان کے لیڈران ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل جمادی الاول 1441 اپریل 2020ء

مسلمانوں کے مکانوں پر شدید سنگ باری کرتے ہوئے اشتعال انگیز نفرے نقاب کرنا میری پہلی بڑی اسٹوری تھی۔ بلند کر رہا تھا۔

میں انگریزی کے ایک شامناہہ کے ساتھ بطور ٹینی منسلک تھا۔ مجھے کرامہ رپورٹ کے ساتھ بطور اسٹینٹ ان فسادات کو کور کرنے کیلئے متعین کیا گیا تھا۔ علاقے میں ایک مقامی ذی اثر ہندو جس کو پہلوان کے نام سے پکارتے تھے، نے دورہ پر آئے صحافیوں، وکیلوں، حقوق انسانی کی تنظیموں کے نمائندوں کیلئے کرسی، چائے پانی وغیرہ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ وہ صحافیوں کیلئے بطور گائیڈ کا کام بھی کرتا تھا۔ متاثرین اور پہلوان صاحب اور ان کے ساتھیوں کی بس ایک ہی رٹ تھی، ”کہ ہم تو صدیوں سے بھائی چارہ سے رہتے آئے ہیں، یہ تو بس باہر کے نامعلوم لوگ دنگا کرنے آئے تھے۔

”خیر آفس میں مجھے کرامہ رپورٹ نے بتایا کہ ایک روز قبل انہوں نے کسی مکین سے ایف آئی آر اور ان کے راشن کارڈ اور دیگر ڈاکومنٹ، کاپی کرنے کیلئے لئے تھے اور اور یجنل ڈاکومنٹ ان کو لوٹانے کیلئے مجھے سیلم پور جانے کا حکم دیا۔ (جاری ہے) ●●●



شمشاں کے پاس مشرقی دہلی سے بی بے پی کے ممبر پارلیمنٹ بیکٹھ لال شrama عرف پر یہم مجھ کو اور اکسارہے تھے۔ درگاہ حضرت نظام الدین کا گنبد یہاں سے نظر آ رہا تھا اور ان کا اعتراض تھا کہ اس کے اوپر جو سبز جھنڈا ہرارہا ہے، وہ پاکستانی پر چم ہے اور وہ اسکے اتنے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ پاس کے ایک مکان میں اٹل بھاری واچپائی اور بی بے پی کے ایک اور لیڈر مدن لال کھورانہ ایک میٹنگ میں مصروف تھے۔ گھنٹہ بھر کے بعد لیڈر ان نمودار ہوئے۔

بھیڑ نے درگاہ کی طرف اشارہ کر کے پھر نفرے لگانے شروع کئے۔ واچپائی نے ماہک سنبحاں کر کہا کہ یہ اسلامی جھنڈا ہے اور اسکا ایک ہی رنگ ہے۔ جبکہ پاکستانی پر چم دور گئی ہوتا ہے۔ جب وہ گاڑی کی طرف جا رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ نالہ کے دوسری طرف تو سخت کر فیونا فذ ہے اور لوگ بھی وہیں ہلاک ہوئے ہیں۔ آخر وہ نالہ پر موجود بھیڑ کو پتھراو کرنے اور اشتعال انگیز نفرے لگانے میمع کیوں نہیں کر رہے ہیں؟

میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کہا کہ نوجوان فساد بھی اسی طرف سے مسلمانوں کے اعتراض سے شروع ہوا۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ رعمل ہے۔ اس طرف کے لوگوں (مسلمانوں) کو یہ بات جان لینی چاہئے۔ جلد ہی میں نے دیکھا کہ بھیڑ خونخوار ناظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ واچپائی نے بھی شاید محسوس کیا کہ میں مسلمان ہوں اور اب اس سوال کے بعد بھیڑ مجھے نشانہ بنائے گی۔ انہوں نے اپنے محافظ کو اشارہ کر کے مجھے نالہ کے دوسری طرف لیجانے کیلئے کہا۔

اسکے ایک سال بعد ہی جب دسمبر 1992ء میں ایودھیا میں بابری مسجد شہید کی گئی، تو دہلی کے ان ہی علاقوں میں جو آجکل تشدید کی زد میں ہیں، فسادات پھوٹ پڑے۔ سیلم پور کی ایک غریب بستی کو، جہاں اکثر مزدور، کبازی کا کام کرنے والے رہتے ہیں کو آگ کے حوالے کیا گیا تھا اور کئی افراد فسادیوں کی چھریوں اور پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ روایتی طرز پر ہی پولیس نے متاثرین کے ہی اہل خانہ کو حراست میں لیا تھا۔ اس فساد میں ملوث افراد کو بے



ہندوستان کے اردو ادب کا بطل جلیل

تحریر: زکریا اورک کینڈا

تعلیم

اختر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ قرآن مجید مع ترجمہ، اردو، فارسی اور انگلش کی تحصیل اپنے والد، والدہ اور پچھا سے کی۔ ضلع مونگیر میں سکول داخل ہو کر 1926 میں دسویں جماعت کی سند درجہ اول میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے پٹنہ کالج پہنچا اور 1928 میں اثر کا امتحان پاس کیا۔ وظیفہ کے حقدار قرار پائے۔

چونکہ ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا اس لئے پٹنہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ڈھانی سال میڈیکل کالج میں پڑھا، دو ایم بی بی ایس کئے۔ بد قسمتی سے تیرے سال ان پر سل (بی بی) کا حملہ ہوا، جس کی بناء پر سلسلہ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ علاج کے لئے آبائی طن اورین واپس آگئے۔ کامل آرام اور علاج معاملے سے دوسال بعد صحت یاب ہو گئے۔ 1933 میں دوبارہ پٹنہ کالج میں بی اے انگلش آزز میں داخلہ لیا۔ 1934 میں دوبارہ بی بی کا حملہ ہوا اگر خدا نے لاج رکھ لی اور بی اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ برف کے لکڑے چوس چوس کر امتحان دیتے رہے۔ ڈاکٹروں نے سینی ٹوریم میں قیام کا مشورہ دیا۔ بستر پر لیٹے لیٹے کئی

افسانے اور نظمیں لکھیں۔ 1933 میں ان کا نکاح محترمہ شکیلہ سے ہو چکا تھا جس کی رفاقت، دلوسزی اور تیارداری سے صحت مندر ہو کر واپس آئے۔ ایم اے اردو کی تیاری سینی ٹوریم میں لیٹے لیٹے کی۔ 1936 میں پٹنہ سے ایم اے اردو فرست ڈویژن میں پاس کیا، پوری یونیورسٹی میں اول رہے اور طلبائی تمغہ کے حق دار قرار پائے۔ آپ امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؑ کی درد والجھ سے کی ہوئی شبینہ دعاؤں کا زندہ ثبوت تھے۔ پوری زندگی موت کی آنکوش میں گزری تھی۔

ڈاکٹریٹ

جب ملک میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو پٹنہ شاخ کے نائب صدر چنے گئے۔ جب دسمبر 1938 میں پٹنہ میں اردو کے پیغمبر امر مقرر ہوئے تو وہ اس عہدے سے مستغای ہو گئے۔ 1956 میں انہوں نے پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ "عبدالماجد مبلغ احمدیہ اور مدرس فارسی کی نواسی تھیں۔ ان سے چار بچے تولد ہوئے۔

ڈاکٹر اختر احمد اردو ادب میں نہایت اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ہندوستان میں اردو ادب کے بطل جلیل تھے۔ ادب کی دنیا میں صفت اول کے افسانہ نویس، ڈرامہ نویس، ادیب، نظریگار، نقاد اور صاحب سخن تھے۔ آپ نے بیس سے زائد بلند پایہ علمی کتب کا ورشہ چھوڑا جن میں مختصر افسانے، تنقید، شاعری کا مجموعہ اور ادب لطیف شامل ہے۔ آپ کی متعدد تصانیف ایم اے اور آزز کے نصاب میں شامل ہیں۔

یکتاۓ عصر مصنف ہونے کے ساتھ آپ مسحور کن مقرر بھی تھے۔ اپنے مانی افسنی کو عمده پیرائے میں بیان کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ جب تک صحت رہی جلسہ سالانہ قادیانی کے موقعہ پر اسلام اور اقتصادیات کے موضوع پر تقریر کرنے کی سعادت پاتے رہے۔ ایک مرتبہ پٹنے کے گردوارے میں انہوں نے سکھوں کے روحانی رہنماؤں کو گوبند جی پر فضح و بلبغ تقریر کی تو ان کو ایک کرپان نظر کی گئی تھی۔

خاندان

اختر احمد 1910ء کا اورین (بہار) میں بزم جہاں آراء ہوئے تھے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید وزارت حسین تھا۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام شمس النساء بنت سید عبد العزیز (رئیس ضلع گیا) تھا۔ ان کے نانا سید نور الحسن حکومت وقت کے اعلیٰ عہدیدار تھے۔ آپ کے پرداد سید عنایت حسین حضرت سید احمد بریلویؒ سے بیعت تھے۔ آٹھ سو سال سے ہندوستان میں آباد، نجابت و شرافت کے لحاظ سے ان کے خاندان کا شمار بہار کے اعلیٰ خاندانوں میں ہوتا تھا۔ یہی اختر احمد بڑے ہو کر اردو ادب کے آسمان پر ماہتاب و آفتاب بن کر چکا۔ اختر احمد چار بھائی بھیں تھے۔ اختر احمد، سیدہ زینب بیگم، سیدہ رقیہ بیگم، سید فضل احمد انسپکٹر جزل پولیس بہار۔ اختر احمد کی والدہ کا جب 1924ء اورین بہار میں انتقال ہو گیا تو ان کے والد محترم نے دوسری شادی صابرہ بیگم سے کی جو مولیٰ عبدالماجد مبلغ احمدیہ اور مدرس فارسی کی نواسی تھیں۔ ان سے چار بچے تولد ہوئے۔

بہار میں اردو ادب کا ارتقاء 1857 تک "زیب قرطاس" کیا جس کی بناء پر ان کو پٹنے یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری عطا ہوئی۔ 1952 میں وہ شعبہ اردو کے صدر مقرر کردئے گئے۔ پٹنے یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری انہوں نے 1957 میں حاصل کی۔ 1960 میں ڈاکٹریٹ ہونے کی وجہ سے ان کو پروفیسر بنادیا گیا۔ علالت کے باعث اگست 1972 میں انہوں نے تعلیم و تدریس سے ریٹائر منٹ لے لی۔

واقف زندگی

ایمان بھی۔"

"میری زندگی نا کامیوں، اور کامیابوں کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ موم تو ہوں تمقی نہ بن سکا، کفر کو دلکش پایا لیکن کافرنہ بن سکا۔" (صفحہ 1100)
(نقوش لاہور، آپ بیتی نمبر جلد دوم صفحہ 1097)

<http://apnaorg.com/books/urdu/naqoosh-bio-2/book.php?flidr=book>

پھر لکھتے ہیں کہ جب میرے دل میں کیوں زم کے وسیع مطالعے کے نتیجے میں مخفی طور پر دہریت اور الحاد کے جرا شیم سرایت کرنے لگے تو امام جماعت احمدیہ کی نایاب اور اعلیٰ اپایہ کی تفسیر کبیر را ہدایت بنی۔ کیوں زم کی ریڑھ کی ہڈی اس کا وہ اقتصادی منصوبہ تھا جس کو ساری دنیا میں رائج کرنے کا پرچار کرتے تھے۔ اس شک اور بے دینی کی حالت میں اختر 1942 میں قادیان گئے اور اپنے شکوک کا اظہار امام جماعت احمدیہ سے کیا۔ حضور نے ان شکوک اور مسائل کو دور کرنے کے لئے اپنے خطبات میں وضاحت فرمائی۔ بعد میں یہ دونوں خطبات کتابی شکل میں "نظم نو" اور "اسلام کا اقتصادی نظام" کے عنوان سے منصہ شہود پر آئے تھے۔ ان مدلول بلغ رسائل کے مطالعہ نے اختر کے تمام شکوک و شبہات رفع کر دئے اور وہ کیوں زم کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ بتان سیچہ چشم نے ان کو گمراہی سے بچالیا اور ان کی جیبن نیاز کو سجدوں سے آباد رکھا۔

بیماری نے ایک بار پھر آن گھیرا۔ 1971 میں وہ اعصابی بیماری میں مبتلا ہو گئے جس کے باعث وہ 1972 میں پٹنے یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدارت سے مستغای ہو گئے۔ ان کا جڑا مسلسل حرکت کرنے لگا تھا جس کی وجہ سے وہ ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پٹنے اور راچی کے ماہرین طب سے مشورہ کیا گیا

اسی کو بڑے نے مجھے ٹک لگانے کا موقعہ دے دیا۔ دردائی، یہ بھی نہیں جانتے یا نہ ہب میرے لئے ایک سالم کشتی نہیں ہے بلکہ ٹوٹی نا ہے۔ یہ ناؤ شکستہ ہو ٹکے کی ہیں۔ کفر و اسلام، اقرار و انکار، یگانگی اور بے گانگی کے مذکور جزر میں ڈوبتا ابھرتا رہا ہوں۔ انجام کیا ہو گا خدا معلوم۔ ہاں یہ جی ضرور چاہتا ہے کہ جس دامن کو پکڑا ہے وہ کبھی نہ چھوٹے۔۔۔ میرے دوست کا میشور پرشاد کہتے ہیں کہ میں یہم حکیم بھی ہوں اور یہم ملا بھی۔ خطرہ جان بھی اور خطرہ

پروفیسر اختر کے خیالات اور نظریہ حیات کی تشكیل میں ان کے تھیاں کا اور اس کے بعد احمدیت کی تعلیم کا بہت بڑا تھا۔ ساری عمر مختلف عوارض کی آما جگاہ بنے رہے۔ آٹھ سال کے تھے کہ تپ محرقة میں مبتلا ہو گئے۔ والد بزرگوار نے عہد کیا کہ اگر یہ نجگانے تو وہ انہیں دینی خدمت کے لئے وقف کر دیں گے۔ اس کے بعد ان کو خسار کی ہڈی میں ناسور کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ سر جری کی گئی اور شفا یا بہو گئے۔ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے کہ میدیکل کالج میں سل کا موزی مرض آن لگا۔ لیکن ساری عمر ان کے مذکور والد محترم کا وقف کا عہد رہا۔ اور وقف کے عہد کو انہوں نے پوری زندگی احسن رنگ میں نبھانے کی پوری کوشش کی۔ بیماری کے باعث جب صحیح طور پر خدمت اسلام نہ کر سکے تو امام جماعت احمدیہ نے فرمایا کہ جو کام تم کر رہے ہو وہی وقف شمار کیا جائیگا۔

امام جماعت احمدیہ نے 1939 میں جماعت کے افراد سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے زندگیاں دین کے لئے وقف کریں۔ اور اپنی جائیداد میں سے ایک مقررہ حصہ دینی کاموں کے لئے وقف کریں۔ خاندانی ماحول کے اثر اور دین دار ہونے کے باعث شروع میں وہ اپنानام سید اختر احمد احمدی لکھ کر اس پر فخر محسوس کرتے تھے۔ امام جماعت احمدیہ کی تحریک کے بعد انہوں نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ وصیت کر دیا۔ قرآن مجید اور جماعت احمدیہ کے قوی اور مدلل اڑپچکا عین مطالعہ انہوں نے پہلے ہی سے کیا ہوا تھا۔

فتویٰ شیش لاہور کے آپ بیتی نمبر میں آپ کی آپ بیتی شائع ہوئی تھی۔ اس میں اپنی دینی غیرت اور حیثیت کے بارے میں لکھتے ہیں: "میرے عزیز دوست پروفیسر معین الدین دردائی نے اپنی ایک کتاب چلوپی میں لکھا ہے کہ اختر مذہب کا 'کو بڑا' ہے۔ اٹھتے بلیختے بات بات میں مذہب۔ لیکن انہیں کیا خبر کہ

جولز رہے تھے اب تک، درو بام زندگی کے وہ ہندر سنار ہے بیں بڑے درد کا فسانہ
وہ بہت تھکا ہوا تھا، اسے نیند آگئی ہے نہ سلاسکی تھی جس کو بھی گردش زمانہ
بڑے غم کی داستان تھی بڑے کرب کی کہانی دل مضطرب ٹرپ کر جو بنا تھا اک ترانہ

جو بھنوں سے کھلیتا تھا رہم میں مسکراتا جو جلا تھا آندھیوں میں وہ چراغ بجھ چکا ہے
یہ خضادھواؤ دھواؤ ہے کہ جلا ہے آشیانہ جہاں بجلیاں گری تھیں وہ چمن سلگ رہا ہے
میرا کعبہ محبت، میری ہر نوشی کا مرکز میرا کاروائیں الافت، سر شام ہی لٹا ہے
اسے آہ، کیسے ڈھنڈوں کہ سب جہاں اندھیرا نہیں رفتتوں سے آگے، وہ کہاں چلا گیا ہے

لیکن کوئی افاقت نہیں ہوا۔ اب بحر ج علاج کی نیڈ اچلے گئے جہاں ان کی اہمیت محترمہ
شکلیلہ کے برادر محترم ڈاکٹر آفتاب احمد مقیم تھے۔ یہاں چھ میینے علاج کیا گیا لیکن
چندال فائدہ نہیں ہوا۔ اس لئے واپس ہندوستان چلے گئے۔ متعای حیات کے
آخری چھ سال اسی اذیت ناک بیماری میں گزرے۔ ہندوستان میں بھی
علاج میں ہر ممکن کوشش کی گئی۔ لیکن صحت بحال نہیں ہوئی۔ آخر 13 مارچ
1977 کو نصف شب کے قریب پنٹہ میں بعمر 60 سال اپنے خالق دمائل کے
حضور حاضر ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ موصی ہونے کے سبب جسم خاکی
قادیان لایا گیا اور بہشتی مقبرہ، قطعہ نمبر 9 میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

ہمدردانسان

اس نابغہ روزگار کی زندگی کے کچھ واقعات ناقابل فراموش ہیں۔ کہا جاتا ہے
کہ ایک غریب لڑکی کی تجهیز و تکفین کا سامان نہ تھا تو اختر نے اپنی بیوی کے سونے
کے کڑے فروخت کر کے تدفین کا انتظام کر دیا۔ ایک بہت ہی عزیز دوست کو
والد کے لئے مقدمہ کی فیس جمع کرنے کے لئے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ اس
وقت ان کی جیب خالی تھی۔ ان کو اپنے امتحان میں جتنے سونے کے میدل ملے
تھے ان کو اونے پونے فروخت کر کے اپنے دوست کی ضرورت پوری کر دی۔
طبیعت میں از حد سادگی تھی۔ ان کو اپنے مہماں کو مٹی کے برتوں میں چٹائی بچھا
کر کھانا کھلانے میں کوئی عار نہ تھا۔

آپ کی شریک زندگی شکلیلہ اختر جو اپنے مزاج میں انفرادیت رکھتی تھیں غیر
معمولی ادیب اور یادگار زمانہ افسانہ نویس تھیں۔ ان کے شاہکار افسانوں کے
مجموعے کئی کتابوں کی صورت میں شائع ہو کر دادخیسین حاصل کر چکے ہیں۔ اردو
ادب میں ان کے بلند پایہ مقام کا اندازہ اس امر سے ہو ستا ہے کہ پنڈ یونورسٹی
کے ایک طالب علم نے ان کے ادبی کارناموں پر تحقیق کر کے پی اچ ڈی کی
ڈگری حاصل کی تھی۔ نقوش لاہور کے آپ بیتی نمبر میں ان کا مضمون آن لائن
موجود ہے۔

<http://apnaorg.com/books/urdu/naqoosh-bio-2/book.php?flidr=book>

شکلیلہ اختر نے وفات حضرت آیات پر جو اشعار کہے وہ ایک غم زده اور
دکھی دل کی کراہ ہیں۔

<http://apnaorg.com/books/urdu/naqoosh-bio-2/book.php?flidr=book>

مرحوم اختر احمد اور بیوی نے اردو زبان کی جو پیش بہا خدمت کی وہ بھی فراموش
نہیں کی جاسکتی۔ ان کی بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک ڈرامہ،
بیسیوں افسانے، ایک ناول بھی ہے۔ تقدیری مضامین کے متعدد مجموعے ہیں۔
ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ پھر شعری تخلیقات کا ایک یادگار مجموعہ ہے۔ غرض ہر صرف

تھے۔ ایک دفعہ جب میں رخصت ہونے لگا تو اپنے چھوٹے بھائی فضل سے کہہ کر کچھ قادیانی لٹریچر میرے بکس میں رکھوادیا۔ مجھ سے کہا نہیں۔۔۔ بنگلہ دیش میں ان کے کئی عزیز بزرگیوں کے ہاتھ کام آگئے اس کا ان پر گہرا اثر تھا۔ آخر میں پارکنسن کے مرض کا شکار ہو گئے تھے۔ ان سے آخری ملاقات 1974 میں ہوئی جب وہ بستر مرگ پر تھے۔ دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ شکایت کی کہ اب کے میرے پاس کیوں نہ ٹھہرے؟ میں نے کہا عالالت میں میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوتی۔ اخترا ایک فرد کا نہیں ایک انجمن کا نام تھا۔ بہار میں ادبی سرگرمیاں ان کے دم سے تھیں۔ آل احمد سرور، خواب باقی ہیں۔ 325-324 صفحات۔ سیدفضل احمد، آئی جی پولیس بہار۔

مضمون نگار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی ملاقات سیدفضل احمد سے 1978 میں ٹورنٹو میں ہوئی تھی۔ یہ غالباً 1978 کی بات ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک سربرا آور دشخیصت سیدفضل احمد سی سماگا تشریف لائے ہیں۔ میں نے ان سے رابطہ کیا، وہ میرے ساتھ بہت پیار اور تعظیم سے پیش آئے۔ آپ دو دھم میں دھلی سفید بشرط اور سفید پینٹ میں ملبوس تھے۔ چہرے پر ممتاز اور سڈول جسم۔ چونکہ میں ان دونوں ایک کمیونٹی نیوز پیپر کا نائب ایڈیٹر تھا اس لئے انٹرویو کا اہتمام ہو گیا۔ اخبار کے ایڈیٹر بھی ان سے ملاقات کے دوران بہت متاثر ہوئے اور فخر یہ ان کا انٹرویو شائع کیا۔ اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود میں نے ان کو سادہ، سراپا عجز اور منکسر المزاج پایا۔ ان کا متین چہرہ، ان کا طرز تناطہ، ان کی من موہنی شخصیت ابھی تک میرے ذہن پر مرتمم ہے۔ آپ نے 20 جون 1999 کو وفات پائی اور موصی ہونے کی وجہ سے بہشتی مقبرہ قادیانی میں آسودہ خاک ہیں۔ اس موقع پر پولیس نے سلامی دی اور معزز زین علاقہ نے اظہار تعزیت کیا۔

آسمان تیری لحد پہ شبغم افشاٹی کرے سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

کتابیات:

۱۔ ماک رام، تذکرہ معاصرین، جلد چہارم، مکتبہ جامعہ لمیڈیا، جامعہ نگر، دہلی 1982 صفحات 237-228

۲۔ آل احمد سرور، خواب باقی ہیں۔ ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1991

۳۔ صوبہ بہار کے اصحاب احمد، ڈاکٹر سید شہاب احمد 2018 کینڈیا صفحات



سخن میں ان کے لازوال کارنامے موجود ہیں۔ کچھ غیر مطبوع تحریریں بھی ہیں۔ بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر تھے۔ بعض معرکے کی رومانوی نظمیں قلم بند کیں جو ان کے مجموعے میں موجود ہیں۔

بلبل خوش نواز ڈاکٹر اخترا احمد کی ادبی خدمات پر ہندو پاکستان کے رسالوں کے خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں جیسے مہر نیم روز کراچی اور ساگنو پٹنہ۔ اسی طرح ایک درجن کے قریب کتابوں میں ان کی ادبی زندگی کے متعلق قابل ذکر مواد موجود ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں: ☆☆ تذکرہ معاصرین از ماک رام بھویجہ، ☆☆ اخترا اور نیوی کے افسانے (مع مقدمہ) از قلم پر و فیسر عبد المغنى، ☆☆ تاریخ ادب اردو جلد دوم پروفیسر وہاب اشرفی، ☆☆ اخترا اور نیوی فنکار اور ناقدر مرتبین مظفر مہدی اور منصور عمر، ☆☆ بہار میں اردو تقدیم ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ☆☆ اردو ڈارمه آزادی کے بعد ڈاکٹر محمد منصور انصاری۔ نقش لاہور 1956 1956 شخصیات نمبر میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے علی الاعلان لکھا تھا کہ مجھے جس شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کی ذات یا برکات ہے۔

نمونہ کلام

ان کی ایک دربار غزل سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

تیرے نصیب میں کہاں سوز تھیں گدا زغم جانے تو کیا کہ دل نشیں میرے لئے ہے نازم
میں نے گلے لگائے تھیں در داشت خوشیاں بول اٹھا سکوت ہی، چھپ نہ سکا یہ رازم
جس کیلئے تجلیاں حسن خیال در دیست جادہ زندگی اسے سلسلہ درازم
آرزوئے دل کی زندگی زہ بھی نشاط بھی قص حیات دم بدم، شعلہ بجان بسازم
حسن کی بیقراریاں پہنچی ہے اک مقام عشق میرے دل حزیں کو ہے تجربہ نیازم
اخترا زار سے کہو، شوق کے مرحلے ہیں اور جلوہ خاص حسن عام، طور نیس فراز م

پروفیسر آل احمد سرور اپنی آپ بیتی خواب باقی ہیں میں رقم طراز ہیں:

"تقدیمی مضامین کے کئی مجموعے نکلے۔ کالج کے ڈراموں کی ہدایت کاری وہی کرتے تھے۔ بڑے اپنے خطیب تھے۔ ایک مرتبہ پٹنے کے گردوارے میں انہوں نے گرو گوند پر اچھی تقریر کی کہ ان کو ایک کرپان نظر کی گئی۔۔۔ جب بھی پٹنے جاتا تو ان کے یہاں ٹھہرتا۔ ان کی بیگم شکلیہ اخترا بھی خود اچھی افسانہ نگار تھیں۔ اور میاں بیوی دونوں خاصے باتوںی تھے۔ اخترا قادیانی



”تو مخفن“ (ب، پ، چ، ح، گ اور ل) کی

ایک ناقابل اشاعت کہانی)

تحریر: اویس احمد

حرام اور حلال کی بحث چھپئے رکھتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے کے ہر طبقے پر حاوی ہونے کی کوششوں میں معروف رہتا تھا۔ اس سلسلے میں کبھی حلاوت تو کبھی حرارت زدہ لبجھ میں بات کرتا یہ ح و الاطبقہ حلومے کا شوقین تھا۔ ح حرمت رسول پر جان قربان کرنے کے نفرے لگاتا اور ہمیشہ دوسروں کی جان لیتا تھا۔ ح دوسرے مذاہب والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ح اس ملک چ میں حجازی طرز حکومت چاہتا تھا مگر جمایت سے محروم تھا۔

اس کے علاوہ بھی ملک چ میں کچھ طبقات تھے۔ ہم ان کو مجموعی طور پر پ' کا نام دے لیتے ہیں۔ یہ وہ طبقات تھے جو پہاڑ جیسی طاقت رکھتے تھے۔ پانی سے لے کر پرندوں تک اور پہاڑوں سے لے کر پاتالوں تک ملک چ کی پاسبانی کرتے تھے۔ ہوا کچھ یوں کہل نے، گ کو لعنت ملامت کرنا شروع کر دیا۔ گ بھلا کب یہ بات گوارا کرتا چنانچہ اس نے چ عوام سے رجوع کیا۔ چ عوام تو چاہتی یہ تھی، ل اور گ کی لگ جائے چنانچہ چ عوام نے چالا کی دکھاتے ہوئے ل کے سامنے ل اور گ کے سامنے، گ کی چاہت کا اظہار شروع کر دیا۔ ح نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور حصول اقتدار کے لیے چ عوام کی جمایت حاصل کرنے کی تگ و دشمنوں کو شروع کر دی۔ چ عوام نے ح کو حسین خواب دکھانے شروع کر دیے اور ح خود کو حقیقی راہنماء محسوس کرنے لگا۔ گ کے لیے یہ گھاٹ کا سودا تھا چنانچہ، گ نے ح کو ساتھ ملانے کے لیے گڑ کا حلومہ پکایا۔ ل کو گ کی گہری چال سمجھیں آگئی۔ ل نے ح کے کچھ لوگوں کو لاکھوں روپے دے دیجے جس سے ح میں پھوٹ پڑ گئی۔ ح کے کچھ حصے کو ساتھ ملا کر ل نے، گ کا مستحلہ حل کرنے کا سوچا۔ چ عوام یہ ساری چکر بازی دیکھ رہی تھی چنانچہ چ عوام نے چاروں صوبوں میں، گ، ل اور ب کو ووٹ ڈال دیئے۔ سب کی اپنی اپنی حکومتیں بن گئیں۔ اب، گ کے لئے رہا ہے اور گ پ کو گھونسہ دکھارہا ہے۔ پ، ح کو آگے کرہا ہے اور ب اپنی باری کے انتظار میں ہے۔ یعنی ”تو مخفن“۔

آپ کو سمجھ آئی؟ نہیں آئی نا؟ کوئی بات نہیں۔ ملک چ میں بھی کسی کو کچھ سمجھ نہیں آتی پھر بھی وہ چنانچہ میں چاول کھا کر ایسیوں میسوں کو چن لیتے ہیں۔ پھر جب چار چوٹ کی لگتی ہے اور چاروں شانے چت ہو جاتے ہیں تو چن چن کر ایسی چکر اتی ہوئی کہانیاں پڑتے ہیں اور چکر کھا جاتے ہیں۔ آپ بھی کہانی پڑھیں اور چکر کھائیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک ملک تھا۔ آپ اس کو اپنی آسانی کے لیے چ سے شروع ہوتا ہوا کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ ملک کے عوام بھی اسی ملک کے نام سے پکارے اور پہچانے جاتے ہیں جیسے چین میں چینی، ایران میں ایرانی اور پاکستان میں پاکستانی رہتے ہیں۔ چناچا اس ملک، چ کے عوام بھی، چ، ہی تھے۔ ملک، چ میں ہر طرح کی چوری چکاری، چالبازی، چور بازاری، چاپلوٹی اور چیر پھاڑ کا دور دورہ تھا۔ عوام بھی، چ تھے لہذا چوری چکاری، چالبازی، چور بازاری، چاپلوٹی اور چیر پھاڑ کے نئے چکر نہ صرف ایجاد کرتی رہتی بلکہ ان پر چوکس ہو کر چلتی بھی رہتی تھی۔ چ عوام کی پسندیدہ غذا چوری تھی جسے وہ چائے کے ساتھ چسکیاں لے کر کھاتے تھے۔

فی الوقت اس ملک میں جمہوریت کا راج تھا۔ ملک کے حکمران کو آپ، گ، تصویر کر لیں۔ حکمران، گ کو ملک کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ گ را فروٹی، گراوٹ، گالم گلوچ، گھٹیا پن، گڑ بڑا اور گناہ کرنے والے گندے لوگ اس کے گرد رہتے تھے اور، گ ان کا گروپیدہ تھا۔ گ گر گڑ کی طرح رنگ بدلنے میں مہارت رکھتا تھا۔ جمہوری دور میں وہ جمہوریت کا علم بردار تھا جبکہ آمریت میں وہ آمریت کا دم بھرتا نظر آتا تھا۔ گ کی "گورنمنٹ" بیڈ گورننس کا شاہکار تھی۔ آج کل اس کا گھرانہ گردش میں آیا ہوا تھا اور پورے گھرانے پر گرداؤ رہی تھی۔ ملک، چ میں ایک سیاست دان بھی تھا جس کو ہم، فرض کر لیتے ہیں۔ ل، لمبی لمبی چھوڑنے کا شوقین تھا۔ قدبھی کچھ لمبا تھا اس لیے لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ ہکل کر، چ عوام کو اپنی لاف و گزاف سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ ل، ل کی پروش لاہور اور لندن میں ہوئی تھی اس لیے اس اکثر وہ لال پیلا رہتا تھا۔ ل، اکثر اپنے مخالفین کو لعنت ملامت بھی کرتا رہتا تھا۔ چ عوام اسے کبھی کھار لال بھکر بھی کر دیتے تھے۔ ل، بھی ملک، چ کا حکمران بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے یہ فرائٹ پکج بھی کرنے کو تیار تھا۔

اسی ملک، چ میں ایک اور سیاست دان بھی تھا۔ اس کو ہم، ب کر لیتے ہیں۔ ب، کو بات کا بتگنڈڑ بنانے کا فن آتا تھا۔ ب کی بیوی اب نہیں رہی تھی اس لیے بعض اوقات، ب، بھکی بھکی حکتیں بھی کر جاتا تھا۔ ب، بھی، چ پر حکومت کر چکا تھا جس کی، چ عوام کو بڑی بھاری قیمت پکانی پڑی تھی۔ ب، جو تھا وہ، گ اور، ل دونوں کا سیاسی مخالف تھا اور بہر صورت اقتدار کی کرسی پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اسی ملک میں ایک طبقہ ایسا تھا جس کو آپ، ح، تصویر کر لیں۔ یہ طبقہ ہمہ وقت



پڑھی ہوئی کتابیں یا پڑھی ہوئی کتابیں؟

تحریر: خطیب احمد

اگر پرانے وقت کی بات کریں تو لوگ مصنف کی کتاب اس کے دستخط کے بغیر لیا نہیں کرتے تھے، اب یہ ان کا مزاج سمجھا جائے یا اصلاحیت جانچنے کا طریقہ، کیونکہ بنا مصنف کے دستخط کتاب کو جعلی تصور کیا جاتا تھا۔ چونکہ ہم تو ویسے ہی کتاب دشمن معاشرے کو جنم دے چکے ہیں۔ جانچنے کی ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ شہر میں فروخت ہونے والی کتابوں کو شہر کی آبادی کے خواندہ طبقے کی شرح کا تقابلی جائزہ لیا جائے، تو کچھا کھل جائے گا۔ اس کی مثال یوں بیجیے کہ اگر شہر کی خواندہ آبادی اگر پانچ ہزار ہے لیکن دو ہزار افراد نے کتابیں خریدیں، تو معلوم ہو جائے گا کہ اصل پڑھنے لکھنے والے افراد کتنے ہیں۔

ویسے آج کل توریل گاڑیوں، بسوں اور عوامی مقامات پر اب ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا، جس کے ہاتھ میں کتاب ہو۔ رسائل و جرائد اور اخبارات پڑھنے والوں کی تعداد کم ہی سہی مگر بہت کم ہو چکی ہے۔ مگر کتاب پڑھنے والے تو اب ناپید ہی ہو چکے ہیں۔

لیکن ذرا اپنی نظر مغرب کی جانب دوڑائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ وہاں کتابوں کی فروخت لاکھوں میں ہے، اب آپ آبادی کا اندازہ کر لیجیے۔ اپنے پڑھوں کے ممالک میں دیکھ لیجیئے کہ وہاں پر بھی سالانہ اتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں، جتنی تو پاکستان میں بھی نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن اب تک کراچی کے اردو بازار کا چکر لگا لیجیے اندازہ ہو جائے گا کہ دیگر ممالک کے مصنفین کی بے شمار کتابیں ہیں، بدستمی سے ہمیں تو اپنا نصاب پڑھنے کے لیے بھی غیر ملکی مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو زیادہ تحصیل شدہ پرچے اور گائیڈ کتابیں ہی وسیع ہیں۔

جبکہ مبشر علی زیدی لکھتے ہیں کہ گلیپ سروے کے مطابق 2019 میں لاسٹریوی جانے والے امریکیوں کی تعداد سینما جانے والوں سے ڈناتھی۔ لیکن اگر ہم اپنے ملک میں دیکھیں تو عزیز واقارب کے گھروں میں کتابیں مشکل سے ہی پائیں گے، حتیٰ کہ کسی کو کچھ کتابوں کے نام بھی معلوم نہیں۔ دراصل یہ ہمارا ایک بڑا الیہ ہے کہ کاش ہم نے پڑھی ہوئی کتابیں پڑھی ہوتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پڑھنے خریدیں مگر پڑھنے کے لیے کتابیں ضرور خریدیں۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں بھی کتاب نظر آجائے تو ہم اسے قدمی دور کی مغلوق سمجھ بیٹھیں گے۔

نوٹ: ادارے کا قدمکار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں

اس بات سے ہم سب آشنا ہیں کہ گپ شپ، سمنی سنائی اور دل کی دھائیاں، باقاعدہ تجویاتی خبروں یا تصدیق شدہ اطلاعات پر انحصار نہیں کرتیں بلکہ میرے کانوں میں پڑھے جیدا نشوروں کے اقوال نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ اس کو لکھتے ہوئے میرا قلم بھی لڑکھڑاتا، نقط میں لکنت آ جاتی ہے۔ اس کی وجہ نہیں کہ مجھے موضوع کے متعلق آ گا ہی نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے کتب خانوں اور گھروں میں کتابیں صرف شیف میں پڑھی ہوئی ہیں۔ کاش پڑھی ہوئی ہوتیں تو کوئی بھی موضوع سمجھانا آسان ہوتا۔

اتفاق سے اس ہنگام زدہ ماحول میں ہماری عقل اس بات کو قبول کر لے لیتی ہے کہ جب کسی شے کو فراد میں پذیرائی حاصل ہو جاتی ہے، ہم سمجھتے ہیں وہ مقبول ہو چکی ہے۔ جیسے کہ اگر کتب خانے میں طلبہ کتابیں پڑھ رہے ہیں یا لوگ کتب میلے سے کتابیں خرید رہے ہیں، تو ہم اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں کہ کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے، اس کو تصدیقی تعصب کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہم اس مغالطے کا شکار ہیں کہ طلبہ کو پڑھتا دیکھ کر ہمارا دل تو خوش ہو جاتا ہے۔ مگر ہمیں یہ اندازہ نہیں کہ بڑے انہاک کے ساتھ سر جھکائے کتابیں صرف محض اساتذہ کے دینے گئے کام کے بوجھ کی وجہ سے پڑھ رہے ہیں یا حقیقی علم حاصل کیا جا رہا ہے۔ چلنے پڑھ رہے ہیں بھی کافی ہے، شاید یہ ان کو مطلع کا عادی بنادے۔

جبکہ مصدقہ اطلاعات کے مطابق اکثر لوگوں کو کتابیں پڑھنے کے بجائے، شو کیس میں سجا کر رکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ، سامنے والے پر اپنا علمی رب قائم کیا جاسکے، تو پھر یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔

اگر آپ سال میں تقریباً 100 یا اس سے کم کتابیں بھی پڑھ لیں یا زندگی میں کم از کم 3000 کتابیں بھی پڑھ لی ہوں، تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں اس انسان کا علم کسی حد تک دگنا ہوگا۔ مگر وہ انسان اس الزام کی زد میں آ جائے گا کہ اپنی علمیت کا رب جھاڑ رہا ہے۔ اصل میں اس انسان نے کتابیں پڑھی ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے یہ سب باتیں سنی پڑتی ہیں۔ خیر مذکورہ باتوں سے امید کرتا ہوں کہ میں سمجھا سکا ہوں گا کہ پڑھی ہوئی اور پڑھی ہوئی کتابوں میں کیا فرق ہے۔



پچاس برس پہلے ملائیت کا انجام بتانے والا فن پارہ:



غلام عباس کا شاہر کا رافسانہ "دھنک"

تحریر: غلام عباس

یہ میسوں صدی کے اوخر کی ایک شب کا ماجرا ہے۔ ہوٹل موہن جوڈا روکی اکھڑوں میں منزل پر جو سب سے اوپھی اور ”باغیچہ آویزاں“ کے نام سے موسم ہے۔ ارباب حکومت کی جانب سے ایک پر تکلف ضیافت نیم بھی دی جا رہی ہے۔ مہمانوں میں دنیا بھر کے ملکوں کے سفیر سائنس دان، مفکر اور صحافی شامل ہیں۔

ہوٹل کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے کم خواب کا ایک شامیانہ جس کے کناروں پر موتیوں کی خوش نما جھار لگی ہے۔ جڑا اولیتادوں پر نصب کیا گیا ہے۔ شامیانے کے نیچے رنگارنگ قالینوں کا فرش بچھا ہے۔ یہ وہی قالین ہیں جو پٹ سن کے سنبھرے ریشے سے بنائے جاتے ہیں اور اپنی نفس بنت، پانیداری اور نقش و نگار کی دل آویزی کے باعث دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان قالینوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کشادہ اور آرام دہ مخلی صوفے رکھے ہیں جن پر معزز مہمان اپنی بیگمات کے ساتھ متمنکن ہیں۔

یہ مہمان جو پاٹج برعاطفوں کے مختلف تمدنوں کی نمائندگی کرتے ہیں اپنا اپنا پرو قارتو می لباس پہنے ہوئے ہیں۔ ان کے جدا جاناک، ان کی مخصوص حرکات و سکنات، ان کی الگ الگ بولیاں، ہر ملک کی عورت کا جدا گانہ حسن، اس کی مختلف طرز آرائش و زیبائش اس کے مخصوص کر شمہ و ادا دیکھنے والوں پر ایک محیت کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔

ہر چند بظاہر کوئی ہنڈا، بلب، گیس یا ٹیوب لائٹ دکھانی نہیں دیتی، پھر بھی سارا پنڈاں بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ جا بجا فوارے چھوٹ رہے ہیں جن کی پھواروں پر رنگ برلنگی شعائیں پڑ رہی ہیں۔ ”باغیچہ آویزاں“ میں قسم قسم کے پیڑ پودے کثرت سے لگائے گئے ہیں جن کے پھولوں کی ملی جل خوبصورتوں میں ایک نشاط کی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔

مہمانوں کے وسط میں ایک اوپھی گول میز پر جو کارچوبی کے کام کے ایک بیش

یہ افسانہ میں نے آج سے دو سال قبل لکھا تھا۔ اس وقت میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اجرام فلکی کی تسخیر کے لیے انسانی مہماں اس قدر شدت اختیار کر لیں گی کہ اگلے دو ہی برس میں انسان کا چاند پر پہنچنا ممکن ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ٹیلی و ڈیٹن کی نشریات میں بھی اس قدر ترقی ہو جائے گی کہ اس کے ذریعے ساری دنیا انسان کی اس فیروزمندی کا ”تماشہ“ دیکھ سکے گی۔

میں چاہتا تو افسانے میں ترمیم و تنسیخ کر کے اسے جدید ترین حالات کے مطابق بنایا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ میں نے تسخیر قمر کو محض انسان کی انتہائی ترقی کے Symbol (علامت) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حقیقت پسندانہ نکتہ نظر سے نہیں، اس لیے ان تبدیلوں سے افسانے کے نفس مضمون میں کچھ فرق نہ پڑتا۔ چنانچہ میں نے اسے جوں کا توں ہی رہنے دیا ہے یعنی جیسا کہ آج سے دو سال پہلے میرے تخیل میں اس کا نقش ابھرا تھا۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کے زیر اثر میں نے خود کو بھی کسی فرقے سے وابستہ نہیں کیا بلکہ ملت اسلامیہ کا ایک فرد سمجھا ہے۔ اپنی اسی حیثیت سے میں نے ملت کے مستقبل کے بارے میں جو خدشات محسوس کیے۔ ان کا اظہار ایک افسانے کے پیرائے میں کیا کہ بھی میراث ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے غیر منقسم ہندوستان میں اہل وطن کی بے حصی، ناقلوں اور فرقہ بندی کو دیکھتے ہوئے انہیں خبردار کیا تھا:

نہ بھجو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
میں نے بھی کچھ اسی قسم کے حالات سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اتنا اور عرض کرنا ہے کہ افسانے میں مسلمانوں کے کسی خاص فرقے یا جماعت یا کسی خاص شخصیت کو ہدف نہیں بنایا گیا اگر کہیں مماثل نظر آئے تو اسے محض اتفاقیہ سمجھا جائے۔

آؤیزاں“ سے دکھائی دیتا ہے اور کہیں سے دکھائی نہیں دیتا۔ خصوصاً رات کے وقت تو جہازوں اور جزیروں کے مکانوں کی روشنیاں دور سے جھلملاتی ہوتی ہیں۔ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

اس وقت فروری کا چاند اپنی پوری تابندگی کے ساتھ رونے زمین پر خنک چاندنی بکھیر رہا ہے۔ اس کا نظارہ بجائے خود ایک عجیب جاذبیت رکھتا ہے۔ مہماں کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ موجودہ تقریب کی مناسبت سے اور بھی غویت کے ساتھ اسے دیکھنے لگتے ہیں۔

آخر ڈیڑھ بجے کے قریب ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ سب مہماں اپنی اپنی نشتوں پر آ کر بیٹھ جائیں۔ اس وقت مہماں کے اشتیاق کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ خصوصاً بعض خواتین پر تو اضطراب کی سی حالت طاری ہے جس پر قابو پانے کے لیے انہوں نے اپنی مٹھیاں بھیجن کر گئی ہیں۔ دم بھر میں سب لوگ جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اپنے صوبوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ سب نے کان ریڈیو کی آواز پر لگا دی۔ کچھ وقت اور انتظار میں گزرنا۔ اس کے بعد اناؤنسر کی آواز یہ اعلان کرتے سنائی دی:

”اب ہم اپنے سنتے والوں کو چاند پر لیے جاتے ہیں جہاں اس وقت اجرام فلکی پر انسانی فتوحات میں ایک نیا اور انوکھا اضافہ ہونے کو ہے۔ لیجیے ہمارے خلاپیا جو اس مہم کو سر کر رہے ہیں آپ سے مناطب ہوتے ہیں“

اس اعلان کے ساتھ ہی ریڈیو سے ایسی گھرگھڑاہٹ سنائی دینے لگی جیسی کسی دور دراز ملک کے اسٹیشن کو ”پکڑتے“ وقت سنائی دیا کرتی ہے۔ اس فضائی گھر بردار کا سلسہ چند لمحے جاری رہا۔ اس کے بعد ایک انسانی آواز اس شور میں سے ابھرنی شروع ہوئی پہلی الفاظ سنائی نہ دیے مگر رفتہ رفتہ واضح ہو گئے:

”میں کیپین آدم خان سکنہ ضلع جھنگ عمر پنیتیس (35) سال آپ سے مناطب ہوں۔ میرا خلائی جہاز اس وقت چاند کی سطح سے صرف پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر رہ گیا ہے۔ جہاز کی رفتار پچھتر میل فی گھنٹہ کر دی گئی ہے۔ مجھ کو چاند کی سطح بہت صاف نظر آ رہی ہے۔ یہ وہی سر زمین ہے جس سائنس دان“ طوفانوں کے سمندر کے نام سے موسم کرتے ہیں۔ عجیب نظارہ ہے پر ہوں بھی اور دلکش بھی۔ لیجیے

قیمت میز پوش سے مزین ہے۔ ایک بڑا ساخن بصورت ریڈیو سٹ رکھا ہے۔ اس سٹ کے اندر چاروں طرف اسپیکر اس ترکیب سے لگائے گئے ہیں کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی سمت بیٹھا ہو اواز صاف سنائی دے سکے۔

اس وقت ریڈیو سے آرکسٹرا کی موسیقی نشر ہو رہی ہے جس کی دھن اس تقریب کے لیے خاص طور پر باندھی گئی ہے اور وہ تقریب کیا ہے؟ وہ یہ کہ آج رات پونے دو سے لے کر دو بجے کے درمیان کسی وقت پاکستان کا پہلا خلاپیا چاند پر اتر جائے گا اور اس کی اس بے نظیر کامیابی کا حال اور چاند پر اس کے مشاہدات براہ راست اسی کی زبان سے نشر کیے جائیں گے۔

گوئیا کے بعض ممالک پچھلے کئی برسوں سے چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اس امر میں اولیٰ حاصل کرنا پاکستان کی قسمت میں لکھا تھا۔ جب پاکستان نے تسبیح قمر کے سلسلے میں اپنے عزم کا اعلان کیا تو پہلے تو ان ملکوں کے سر برآ ہوں کو یقین ہی نہیں آیا کہ پاکستان نے اس میدان میں اس قدر ترقی کر لی ہے۔ مگر جاپان کے سفیروں نے جو پاکستان میں مقیم تھے پاکستان کے ارادے کی تصدیق کر دی تو ان کی حیرت کی انتہاء رہی اور انہوں نے اپنے اپنے ہاں کے سائنس دانوں اور دانشوروں کو اس تقریب کا حال پختہ خود دیکھنے کے لیے یہاں بھیج دیا۔

اس وقت رات کا ایک نجح چکا ہے۔ مگر دنیا کے دور دراز حصوں سے آئے ہوئے ان مہماں میں سے کسی کے چہرے سے بھی تحکماٹ یا کسل مندی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ اس کے عکس جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ چاق و چوبنڈ نظر آ رہے ہیں۔

ہوٹل کے خدام زرنگار وردیاں پہنے ہلکے پھلکے طعام اور مشروبات کے طشت اٹھائے مہماں کی تواضع میں مصروف ہیں۔ کچھ لوگ باہم گفتگو کر رہے ہیں۔

کچھ ریڈیو کی موسیقی سن رہے ہیں جس کا سلسہ کبھی کبھی منقطع ہو جاتا ہے اور اناؤنسر آج رات کے پروگرام کی تفصیل یا کوئی مقرر چاند کی مہم کے سلسلے میں ابتدائی کامیابیوں کا حال سنانے لگتا ہے کچھ مہماں جب بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں تو شامیانے سے باہر نکل کر ”باغیچہ آؤیزاں“ کی پر فضاروشنوں پر ٹھلنے یا گردو نواح کا منظر دیکھنے لگتے ہیں۔ یوں تو شہر میں کئی عمارتیں ہوٹل موہن جوڑا رو سے بھی اوپنجی اوپنجی ہیں۔ مگر مضائقات اور سمندر کا جیسا لفربیب نظارہ ”باغیچہ

تما تو خلا پیا کی آواز یہ ہتھی ہوئی سنائی دی:
”آپ کو یہ معلوم ہی ہو گا کہ چاند میں دو ہفتے کا دن ہوتا اور دو ہفتے کی رات۔
یہاں اس وقت دن ہے جس کو شروع ہوئے ہمارے حساب سے تقریباً چھتیں
گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میرے پاس اتنی آسیں جن موجود ہے کہ میں یہاں چاند کا پوار
ایک دن برس رکسکوں۔ اور میرے خلائی جہاز میں اتنا یندھن ہے کہ وہ مجھے بغسل
خدا خیر و عافیت کے ساتھ وطن پہنچا سکے۔



رابعہ بُغْتَیٰ

نظم

مجھ سے تاخیر ہو گئی ذرا سی
بات کو سمجھنے میں
وقت کی نزاکت کو
حیات کی ضرورت کو
جا بجا جو ٹوکا ہے
میری معصوم قدروں کو
گرچہ مجھے تو لگتا تھا
راہ میں جو ختم جائے
ایسی زیست کیا کرنی
دھول جس پر پڑ جائے
ایسا اخلاص کیا کرنا
دھند جن پر پڑ جائے
ایسے رفیق کیوں ہوں پھر
آج میں نے جانا ہے۔۔۔
زخم اپنے رس جائیں
تو تجھ سے کیا گلہ جانا
ہاں مجھ ہی سے تاخیر ہو گئی
بات کو سمجھنے میں۔۔۔



اب بلندی صرف دو ہزار فیٹ رہ گئی ہے جہاز کی رفتار چالیس میل فی گھنٹہ ہے۔
مجھے اس سفر میں محمد اللہ کسی قسم کا حادثہ پیش نہیں آیا۔ خدا نے چاہا تو میرا جہاز
حسب توقع آہستگی کے ساتھ چاند پر اتر جائے گا۔ اب میں ایک ہزار فیٹ
سے بھی کم بلندی پر ہوں۔ جہاز کی رفتار بذریعہ کم کی جا رہی ہے۔ لیکن اب
میں صرف سات سو فیٹ چاند کی سطح سے بلند ہوں۔ پانچ سو فیٹ۔ رفتار
دس میل فی گھنٹہ۔ صرف اڑھائی سو فیٹ۔ سو فیٹ۔ الحمد للہ کہ میرا خلائی جہاز
صحیح سلامت چاند کی سطح پر اتر گیا ہے۔ اس وقت پاکستانی گھریلوں کے
مطابق رات کا ایک نج کراڑ تالیس منٹ اور چار سکینڈ آئے ہیں۔ پاکستان
زندہ باد۔

جلے کے تمام شرکانے جو دم سادھے بیٹھے تھے اور جن کے دل کی وھر کن پل
پل میں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی ایک ساتھ اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ ریڈ یو
سے خلا پیا کی آواز سنائی دینی بند ہو گئی اور اس کے بجائے قومی ترانہ بجا شروع
ہوا۔ سب لوگ تنظیماً کھڑے ہو گئے۔ جب ترانہ ختم ہوا تو جلے کا پنڈاں تایوں
کے شور اور نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے گونج اٹھا۔ غیر ملکی سفیر، سائنس داں اور
اہل دانش اپنی نشتوں سے اٹھاٹ کر ارباب حکومت کے پاس جانے ان سے
مصالحہ کرنے اور انہیں مبارکباد دینے لگے۔ یہ سلسہ کچھ دیر جاری رہا۔ اس کے
بعد ریڈ یو سے پہلے کی طرح کھڑا ہٹ سنائی دینے لگی۔ سب مہماں جلدی
سے پھر اپنی اپنی جگہ آبیٹھے اب کپیٹن آدم خان کی آواز پہلے سے بھی صاف
سنائی دی:

”ابھی ابھی میں نے اپنا قومی پرچم“ طوفانوں کے سمندر ”کی سر زمین پر گاڑ دیا
ہے۔ چاند کی سطح جبی ہوئی بھوبنگ کی طرح ہے۔ کہیں سخت کہیں نرم مگر اس میں
پاؤں نہیں دھنٹے جا بجا دراڑیں اور گڑھے ہیں۔ کہیں کہیں یہ گڑھے بہت بڑے
بڑے ہیں جسے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے ہوں۔ پرچم گاڑنے کے مقدس
فریضے سے فارغ ہو کر میں نے سب سے پہلے اس کے سامنے میں اس خدائے لم
یزل کے حضور نماز شکرانہ ادا کی جس کے نفل و کرم سے آج ہمارے ملک نے اپنا
صحیح مقام پالیا ہے اور اب وہ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور ممالک
کی صاف میں شامل ہو گیا ہے۔ پاکستان پاکندہ باد۔“

جلے کا پنڈاں ایک مرتبہ پھر نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے گونج اٹھا۔ جب شور



افسانہ: تھامی کا بینگن

تحریر: کرشن چندر

میں نے غور سے بینگن دیکھا۔ بینگن کے اندر بیچ کچھ اس طرح ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے کہ لفظ اللہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔
”ہے بھگوان“ میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ تو مسلمانوں کا اللہ ہے۔“

محلمہ پوریاں جہاں میں رہتا تھا ملا جلا محلہ ہے یعنی آدمی آبادی ہندوؤں کی اور آدمی مسلمانوں کی ہے۔ لوگ جو ق در جو ق اس بینگن کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ ہندوؤں اور میسیحیوں کو تو اس بینگن پر یقین نہ آیا، لیکن حاجی میاں چھنن اس پر ایمان لے آئے، اور پہلی نذر نیاز انھوں نے ہی دی۔ میں نے اس کٹھے ہوئے بینگن کو اس شیشے کے بکس میں رکھ دیا جس میں تاج محل رکھا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک مسلمان نے اس کے نیچے ہر اک پڑا بچھا دیا۔ میں میاں تمبا کو دوائے نے قرآن خوانی شروع کر دی۔ پھر کیا تھا، شہر کے سارے مسلمانوں میں اس بینگن کا چرچا شروع ہو گیا۔ جناب! سمیتی پورہ سے میکن پورہ تک اور بجوارے سے کمائی گڑھ تک اور ادھ ٹیلا میاں کے چوک سے لے کر محلہ کوٹھیاں تک سے لوگ ہمارا بینگن دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ لوگ باغ بولے، ایک کافر کے گھر میں ایمان نے اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ نذر نیاز بڑھتی گئی۔ پہلے پندرہ دنوں میں سات ہزار سے اوپر وصول ہو گئے۔ جس میں سے تین سورو پے سائیں کرم شاہ کو دیے، جو چرس کا دم لگا کر ہر وقت اس بینگن کی نگرانی کرتا تھا۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب لوگوں کا جوش ایمان ٹھنڈا پڑتا دکھائی دیا، تو ایک رات جب سائیں چرس کا دم لگا کر بے سدھ پڑا تھا، میں نے آہستہ سے اپنی بیوی کو جو گایا اور کٹھے ہوئے بینگن کے اوپر سے شیشے کا بکس ہٹا کر کہا، ”دیکھو کیا دکھائی دیتا ہے؟“۔ وہ بولی۔ ”اللہ“۔

میں نے کٹھے ہوئے بینگن کا رخ ذرا سر کیا اور پوچھا، ”اب کیا دکھائی دیتا ہے؟“۔ ”اوام‘ ارے یہ تو اوم ہے۔“ میری بیوی نے انگلی ٹھوڑی پر رکھ لی۔ اس کے چہرے پر استحباب تھا۔

راتوں رات میں نے پنڈت دیال کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے بلا کر کٹھے ہوئے بینگن کا بدلا ہوا رُخ دکھایا۔ پنڈت دیال نے چیخ کر کہا،

تو جناب جب میرم پور میں میرا دھنہ کسی طور نہ چلا، فاقہ پر فاقہ ہونے لگے اور جیب میں آخری اٹھنی رہ گئی تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ گھر میں تھوڑا سا آٹا بھی نہیں ہے کیا؟

وہ نیک بخت بولی۔ ”چار چھپتی کا ہو گا۔“

میں نے جیب سے آخری اٹھنی نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”جا، بازار سے بینگن لے آ، آج چھپتی کے ساتھ بینگن کی بھاجی کھالیں گے۔“ وہ نیک بخت بہت فکر مند ہو کر بولی۔ ”اس وقت تو کھالیں گے، شام کے کھانے کا کیا ہو گا؟“

”تو فکر نہ کر، وہ اوپر والا ہے گا۔“ میں نے کہا۔

پھر میری نظر شیشے کے اس بکس پر پڑی جس میں چھوٹا سا تاج محل رکھا ہوا تھا۔ یہ تاج محل میں نے نئی نئی شادی کے دنوں میں اپنی بیوی کے لیے آگرہ میں خریدا تھا اور تاج محل کو دیکھ کر ہی خریدا تھا۔ محبت بھی کیا چیز ہے، اس بکس روپے کے تحفے کو پا کر میری بیوی کا چاند سا مکھڑا گلابی ہو گیا تھا۔

اس وقت جب میں نے اس شیشے کے تاج محل کو دیکھ کر کہا۔ ”کچھ نہ ہو تو اس کھلو نے کو بیچ دیں گے۔“ تو جناب اس کا چہرہ ایسا پہلا پڑ گیا جیسے کسی نے یکا یک اس کے چہرے کا سارا خون کھیچ لیا ہو، خوف، مجبوری اور نا امیدی کے ملے جلے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”نہیں، میں اسے بیچنے نہ دوں گی، یہ تو..... یہ تو میرے سہاگ کی نشانی ہے۔“

میں نے اس کا غصے ٹھنڈا کرتے ہوئے بہت نرمی سے کہا۔ ”اچھا نہیں بیچیں گے اسے، کچھ اور بیچ دیں گے، ہو سکتا ہے اوپر والا کوئی اور سبیل کر دے، تو اس وقت جا کر بینگن تولے آ، بھوک سے مراجا ہارہوں۔“

وہ بازار سے بینگن لے آئی۔ رسولی میں بیٹھ کر اس نے پہلا بینگن کاٹا ہی تھا کہ اسے اندر سے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

”ارے“ اس کے منہ سے بے اختیا کلا۔

”کیا ہے؟“ میں رسولی کے اندر گیا، اس نے مجھے کٹا ہوا بینگن دکھایا۔

”دیکھو تو اس کے اندر کیا لکھا ہے؟“

پادری ڈیورینڈ سے ملوں گا۔“

کٹے ہوئے بینگن میں مسیحی صلیب کو دیکھنے کے لیے پادری ڈیورینڈ اپنے ساتھ گیارہ عیسایوں کو لے آئے اور بینگن کی صلیب دیکھ کر اپنے سینے پر بھی صلیب بنانے لگے۔ اور عیسایوں کے بھجن گانے لگے اور سر پر جالی دار رومال اور ٹھیکنے خوب صورت فراہ ک پہنے، سڑوں پنڈلیوں والی عورتیں اس مجزرے کو دیکھ کر نہال ہوتی گئیں۔ شہر میں تناوا اور بھی بڑھ گیا۔ ہندو کہتے تھے اس بینگن میں اوم ہے، مسلمان کہتے تھے اللہ ہے، عیسائی کہتے تھے صلیب ہے، بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے پر پتھر پھینکنے جانے لگے۔ اکاً دکاً چھرے بازی کی واردیں ہونے لگیں۔ سمی پورہ میں دو ہندو مارڈاں لے گئے اور مستزی محلے میں تین مسلمان۔ ایک عیسائی شہر کے بڑے چوک میں ہلاک کر دیا گیا، شہر میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی۔

جس دن میری گرفتاری عمل میں آنے والی تھی، اس سے پہلے دن کی رات میں نے بینگن کوموری میں پھینک دیا، گھر کا سارا سامان باندھ لیا اور بیوی سے کہا، ”کسی دوسرے شہر میں چل کر دوسرا دھندا کریں گے۔“

”تو جناب! تب سے میں بنبی میں ہوں۔ میرم پور کے ان دو ہمینوں میں جو رقم میں نے کمائی تھی، اس سے ایک ٹیکسی خرید لی ہے۔ اب چار سال سے اس ٹیکسی کو چلاتا ہوں، اور ایمانداری کی روزی کھاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر میں نے بار کی میز سے اپنا گلاس اٹھایا اور آخری گھونٹ لے کر اسے خالی کر دیا۔ یکا یک میری نگاہ میز کی اس سطح پر گئی، جہاں میرے گلاس کے شیشے کے پیندے نے ایک گیلانشان بنادیا تھا، میں نے اپنے دوسرے ساتھی ٹیکسی ڈرائیور محمد بھائی سے کہا۔

”محمد بھائی! دیکھو تو اس گلاس کے پیندے کے نیچے نشان بن گیا ہے، اوم ہے کہ اللہ؟“

محمد بھائی نے غور سے نشان کو دیکھا، مجھے دیکھا پھر میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار کر کہا،

”ابے سالے یہ بنبی ہے، یہاں نہ اوم ہے نہ اللہ نہ صلیب۔ جو کچھ ہے روپیہ بس روپیہ۔“

اتنا کہہ کر محمد بھائی نے میز پر ہاتھ پھیر کر پانی کے نشان کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔



”اُرے یہ قوام ہے اوم۔ اتنے دنوں تک مسلمان دھوکا دیتے رہے۔“

اس کی چیخ سن کر سائیں کرم شاہ جاگ گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ وہ بچھی پچھی سرخ آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پنڈت رام دیال نے اسے لات مار کر کہا، ”نکل بے، ہمارا دھرم بھر شٹ کرتا ہے، اوم کو اللہ بتاتا ہے۔“

بس پھر کیا تھا سارے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ کٹے ہوئے بینگن کے اندر دراصل ”اوم“ کا نام کھدا ہوا ہے۔ اب پنڈت رام دیال نے اس پر قبضہ جمالیا۔ رات دن آرتی ہونے لگی۔ بھجن گائے جانے لگے، چڑھاوا چڑھنے لگا۔ میں نے رام دیال کا حصہ بھی رکھ دیا تھا کہ جو محنت کرے اسے بھی پھل مانا چاہیے، لیکن بینگن پر ملکیت میری ہی رہی۔

اب شہر کے بڑے بڑے سنت جوگی اور شدھ مہاتما اور سوامی اس بینگن کو دیکھنے کے لیے آنے لگے، جہاں اللہ نے اوم بن کر اس کے ہوئے بینگن میں گویا مسلمانوں کو شکست دی تھی، اور پانی پت کی تینوں لڑائیوں کا بدلہ چکا دیا تھا۔ شہر میں جا بجا لیکھر ہو رہے تھے، ہندو دھرم کی فضیلت پر دھواں دھار بھاش دیے جا رہے تھے۔ شہر میں تناوا کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

ہندو کہتے تھے یہ اوم ہے، مسلمان کہتے تھے یہ اللہ ہے۔ اللہ اکابر۔ ہری اوم سست۔ اگلے پچھیں دنوں میں کوئی پندرہ بیس ہزار کا چڑھاوا لوگوں کا خمار پھر ڈھلنے لگا۔

تو جناب! میں نے سوچا اب کوئی اور ترکیب لڑانی چاہیے۔ سوچ سوچ کر جب ایک رات پنڈت رام دیال بھنگ کے نشے میں دھن فرش پر لیٹے ہوئے تھے، تو میں نے اپنی بیوی کو جگا کر کہا، ”نیک بخت! دیکھو اس شیشے کے بکس کے اندر کٹے ہوئے بینگن کے اندر تمھیں کیا دکھائی دیتا ہے؟“

”اوم ہے صاف اوم ہے۔“

میں نے اوم کا زاویہ ذرا سما اور سر کا دیا! اور پوچھا ”اب بتا کیا دکھائی دیتا ہے؟“ وہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ منہ میں انگلی ڈال کر بولی، ”ہے رام! یہ تو عیسایوں کی صلیب ہے۔“

”شش۔“ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”بس کسی سے کچھ نہ کہنا صبح تک چپ رہنا ہو گا۔ کل اتوار ہے، کل صبح میں



☆ یورپ:

انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب سے قبل وہاں عورت، مرد کے ظلم و ستم کا شکار تھی۔ کوئی ایسا قانون نہیں تھا جو عورت کو مرد کے ظلم و ستم سے حفاظت فراہم کرتا۔ انگلستان کے قانون کے مطابق شادی کے بعد عورت کی شخصیت مرد کی شخصیت کا ایک جز بن جاتی تھی۔ عورت مرد کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کر سکتی تھی۔ مرد چاہتا تو عورت کو وراثت سے محروم کر دیتا لیکن بیوی کی جانبی دادکا وہ جائز حق دار سمجھا جاتا تھا۔ John Stuart Mill اپنی کتاب غلامی نسوان میں رقم طراز ہے: ”انگلستان کے قدیم قوانین میں مرد کو عورت کا مالک تصور کیا جاتا تھا۔ وہ اس کا بادشاہ مانا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شوہر کے قتل کا اقدام، قانونی اصطلاح میں ادنیٰ بغاوت کہلاتا، لیکن اگر عورت اس کا ارتکاب کرے تو اس کی پاداش میں اسے جلا دینے کا حکم تھا۔“ رابرٹ بریفالٹ کا کہنا ہے: ”پانچویں سے دسویں صدی تک یورپ پر گھری تاریکی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ اور زیادہ گھری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ اس دور کی وحشت زمانہ قدیم کی وحشت سے کئی لگنا زیادہ تھی، کیوں کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی، جو سڑکی ہو، اس تمدن کے نشانات مث رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی۔“

☆ آریائی تہذیب:

آریائی معاشرے میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی، سوائے ایک باندی کے۔ شوہر کو یہ اختیار تھا کہ اپنی بیوی یا بیویوں میں سے جس کو بھی چاہے کسی دوسرے بے روزگار شخص کو اس مقصد کے لیے دے کہ وہ اس سے ذریعہ معاش میں مدد لے۔ اس میں عورت کی رضامندی شامل نہیں ہوتی تھی۔ عورت کو شوہر کے مال و اسباب پر تصرف کا کوئی حق نہیں تھا۔ اولاد، شوہر کی ملکیت تسلیم کی جاتی تھی۔ آریاؤں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ عورت ناپاک ہے اور اس کی نظر بد کا اثر ہوتا ہے اور خاص طور پر اگر کسی بچے پر اس کی بدنظر پڑ گئی تو بچے پر کوئی نہ کوئی بدنختی ضرور آئے گی۔ اس لیے بچے کو نظر بد سے بچانا ضروری سمجھا جاتا تھا، بالخصوص اس بات کا تیال رکھا جاتا تھا کہ کوئی عورت بچے کے پاس نہ آئے تاکہ اس کی شیطانی ناپاکی بچے کے لیے بدنختی کا باعث نہ ہو۔

معروف چینی سیاح ”یون سانگ“ کا کہنا ہے کہ آریا قانون معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی رشتے کا بھی استثناء نہیں تھا۔ جن رشتوں سے

عورت ایک معمتا، ایک پہلی، یا انسان! یہ بحث کوئی نئی نہیں ہے۔ ازل سے جاری ہے اور آج بھی اس پر مکالمہ ہورہا ہے، ہوتا رہے گا اور ایسی بحث جو ہر پل اک نیا موڑ لے لیتی ہے۔ آئیے! دیکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم کی تہذیب اور مذاہب میں عورت کی حیثیت اور مقام کیا تھا۔

☆ یونان:

جسے تاریخ انسانی میں تہذیب، تمدن، علم اور فن کا منبع سمجھا جاتا ہے، میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یونانیوں کے مطابق عورت ایک ادنیٰ مخلوق تھی اور عزت و احترام کے قابل صرف مرد تھا۔ سقراط جیسا فلسفی کہتا تھا: ”عورت سے زیادہ فتنہ و فساد کی چیز دنیا میں کوئی نہیں، وہ دفعی کا ایک درخت ہے کہ بہ ظاہر بہت خوب صورت نظر آتا ہے لیکن اگر چڑیا اس کو کھا لیتی ہے تو وہ مر جاتی ہے۔“ افلاطون مساوات مردوں کا مخفی زبانی دعوے دار تھا۔ عملی زندگی میں اس کا کوئی کردار نہیں رہا۔ شادی صرف اس لیے کی جاتی تھی کہ طاقت و رسایہ پیدا کیے جاسکیں۔ اسپرٹا میں یہ قانون تھا کہ جسمانی کم زور شوہروں کو اپنی بیویاں کسی نوجوان کو سونپ دینی چاہیے میں تاکہ طاقت و رسایہ ہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔

انسانیکو پیدی یا برثانیکا کے مطابق: ”قدیم یونانی تہذیب میں عورت کا مقام اور حیثیت صرف بچے پالنے والی لوٹی کی تھی۔ وہ گھر میں قید اور تعلیم سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ عورت، گھر اور سامان کی حفاظت پر مامور ایک ملازم تھی۔ اس کے اور اس کے شوہر کے غلاموں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتی تھی اور نہ طلاق لے سکتی تھی۔ لیکن اولاد نہ ہونے کی صورت میں شوہر اسے طلاق دے سکتا تھا۔ مرد اپنی زندگی اور وصیت میں اپنی بیوی کسی کو بھی بے طور تحرف دے سکتا تھا۔ عورت کو خود کسی چیز کے فروخت کرنے کا اختیار نہ تھا۔ یونان میں بھی بڑی کی ولادت باعث ندادت سمجھا جاتا تھا۔

☆ روم:

رومی معاشرے میں بھی عورت حقوق سے محروم اور احترام کے لا اق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وہ مردوں کی سنگ دلی اور ظلم کی پچکی میں پہن رہی تھی۔ اگر مرد کو اپنی بیوی کے کردار پر ذرا سا بھی مشک ہوتا تو وہ اسے قانونی طور پر قتل کرنے کا حق رکھتا تھا۔ بابل کی تہذیب کے عروج کے دوران بھی عورت کو خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر باپ اپنی بیٹیوں کو فروخت کر دینے تھے۔

ازدواجی تعلقات متمدن سماج میں ہمیشہ غیر قانونی رہے ہیں، انہیں ان کی حرمت کا پاس و لحاظ نہ تھا۔ اس شدید شہوانی رجحان کے خلاف ”مانی“ نے تجریک کی تحریک چلائی تھی اور شادی کو حرام قرار دے دیا تھا۔ پھر مانی کی تحریک کے خلاف ”مزدک“ نے آواز اٹھائی اور اس نے تمام عورتوں کو سب کے لیے جائز ٹھہرا�ا۔ اس تحریک کے نتیجے میں وہ سماج جنسی انارکی کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔

☆ قدیم مصر:

قدیم مصری عورت کو تمام حقوق حاصل تھے۔ اسے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن پھر اس سے اس کا یہ مرتبہ بدتر تھے چھین لیا گیا۔ مصر میں بھی کئی ایسی رسماں رائج تھیں جو عورت کو نہایت پستی میں دھکیل دینے کے لیے کافی تھیں۔ نکاح کے بعد عورت، ناصر مرد کی ملکیت قرار پاتی تھی بلکہ شادی کے بعد عورت کا سارا مال بھی مرد کے نام ہو جاتا تھا۔ اولاد پر بھی عورت کا حق بالکل نہیں تھا، وہ مرد کی غلام بن کر رہ جاتی تھی۔ لیکن بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ قدیم مصر میں عورت کا سماجی مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کے مطابق نکاح نامہ کی سب سے پہلے ایجاد قدیم مصر میں ہوئی تھی۔

☆ عرب:

عرب سماج تو مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عورت کا مقدر ذلت، رسوانی اور اس کی حیثیت ایک سنتی جنس جیسی تھی۔ اسے پیدا ہوتے ہی زندہ دن کر دیا جاتا تھا، اس لیے کہ وہ باپ کے لیے عار تھی۔ مرد کو تمام حقوق حاصل تھے اور عورت صرف غلام اور سامان تجارت تھی۔

☆ قدیم ہندوستان:

انسانیکلو پیڈ یا برٹانیکا کے مطابق: ”ہندوستان میں مخلوق ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی تھی، ”منو“ کے مطابق عورت رات دن اپنے سر پرستوں کے تحت حالتِ انحصاری میں ہونی چاہیے۔“ کچھ مفکرین کا کہنا ہے کہ ویدک عهد میں عورت کا سماجی رتبہ کافی بلند تھا۔ عورتوں کو مکمل آزادی حاصل تھی، وہ پورے اختیار کے ساتھ اپنے شوہر کے انتخاب میں حصہ لیتی تھیں۔ جیون ساختی منتسب کرنے کی اس رسم کو ”سوہبر“ کہا جاتا تھا۔ لیکن پھر وہ سماج آخری ویدک دور میں زوال پذیر ہوتا گیا۔ رام شرمن شرما کے مطابق: ”یہ سماج پدری تھا۔ اس لیے لوگوں کی تمنا ہوتی تھی کہ ہر بار بیٹا ہی پیدا ہو۔ لوگ دیوتاؤں سے خاص طور پر اتنا کرتے تھے کہ ایسے بہادر بیٹے پیدا ہوں جو جنگیں لڑ سکیں۔ رگ وید میں اگرچہ بچوں اور مویشیوں کی افزائش کے لیے جگہ جگہ دعا ملی ہیں، مگر کسی ایک جگہ بھی بیٹی کی افزائش کے لیے دعا نہیں ملتی۔“

ویدک دور کے بعد دھرم شاسترا کے دور میں عورت کی حیثیت نہایت پست تھی۔ کم سنی کی شادی کی حوصلہ افزائی کی گئی اور بیواؤں کی شادی کو نظر انداز کیا

جانے لگا۔ لڑکیوں کی پیدائش کو اس حد تک مخصوص سمجھا جانے لگا کہ بے شمار والدین نو مولود لڑکیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ بیواؤں کا جیون اجیرن تھا اور ستر کی رسم عام تھی۔ رامائن اور مہا بھارت کے عہد میں عورت کی حالت مزید ابتر ہو گئی تھی۔ اسے تمام تر برائیوں کا منع سمجھا جاتا تھا۔ اس عہد میں ”منو“ کے قوانین لوگوں کے لیے خدائی احکامات سمجھے جاتے تھے۔ منو کے مطابق عورت کو شودر کا درجہ دیا جاتا تھا۔ ہندو مذہب میں دھرم شاستر کی بنیاد پر کئی سستریاں لکھی گئیں، جن میں منوسمرتی سب سے زیادہ مشہور اور اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اسی کی بنیاد پر ہندو قانون بنایا گیا ہے۔ منوسمرتی کو ہندو سماج کے معاشرتی و عائلی قوانین کا مأخذ سمجھا جاتا ہے۔ منوسمرتی کے مطابق: ”عورت کو باپ یا بھائی اپنی مرضی سے کسی بھی شخص کے حوالے کر دے تو اسے زندگی بھرا س کی تابعدار رہنا چاہیے۔ یوں کو اپنے شوہر کا آدھا بدن قرار دیا گیا ہے چنانچہ عورت کا اپنا کوئی انفرادی وجود نہیں ہے۔“ ہندو دھرم کی مقدس مذہبی کتب میں بھی عورت کو وہ عزت و احترام نہیں دیا گیا جو مردوں کو حاصل تھا۔ مہا بھارت، پران اور رامائن جیسی مقدس کتب میں عورت سے متعلق ایچھے خیالات نہیں ملتے۔ بخاطر واکرنے اپنی کتاب ”ہندو ولڈ“ میں رامائن اور مہا بھارت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے: ”اس زمانے میں یہ عقیدہ عام تھا کہ عورتیں ناپاک اور مکروہ ہیں اور مرد کی روحاںی نجات میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان میں ساری براہیاں بھری پڑی ہیں۔ جھوٹ، فریب، دھوکا، ہوس پرستی، کمر و فریب اور عقل کی کمی۔ غرض دنیا کی ساری براہیوں کا مجموع عورتیں ہیں۔“

مقدس پران کے مطابق: ”شراب کی تین قسمیں ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ نشہ آور عورت ہے۔ اسی طرح زہر کی سات قسمیں ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مہلک عورت ہے۔“

مختلف مذاہب میں عورت کی حیثیت

☆ یہودیت:

یہودی روایات کے مطابق عورت ناپاک وجود ہے اور اس کا نات میں مصیبت اسی کے سبب ہے۔ ان کے نزدیک مرد نیک سرشنست اور حسن کردار کا حامل اور عورت بد طینت اور مکار ہے، کیوں کہ اس نے آدم کو بہلا پھسلا کر پھل کھانے پر آمادہ کیا جس سے خدا نے منع کیا تھا۔ یہودی شریعت میں مرد کا اختیار اور عورت کی مخلوقیت نمایاں ہے۔ عورت باپ کی رضامندی کے بغیر خدا کو راضی کرنے کے لیے بھی کوئی منت اور نذر نہیں مانگ سکتی۔ عورت کو دوسرا شادی کا بھی حق حاصل نہیں تھا۔ عورت وصیت، گواہی اور وراثت جیسے حقوق سے بھی محروم تھی۔ یہودی قانون کے مطابق مرد وارث کی موجودی میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی تھی۔

☆ عیسائیت:

آفریں تھا کہ اس کے نتیجے میں فکر و نظر کی دنیا ہی بدل گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خواتین نے ایک نئی تاریخ رقم کی جس کی مثال پہلے بھی موجود نہ تھی اور آج کے نام نہاد ترقی یافتہ دور میں بھی ناپید ہے۔ اسلام، خواتین کے حقوق کا پاس دار ہے۔ قرآن و احادیث میں مردوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ عورتوں کے معاملے میں عغود رگز اور زرم خوئی سے کام لیں۔ ان کی جذباتیت کو ملحوظ رکھیں۔ ان کی حساس طبیعت اور نفاست کا خیال رکھیں۔ ان سے اچھا سلوک کریں اور ان کے حق میں بہترین ثابت ہوں۔ اگر وہ غلطیوں کی مرکب بھی ہوں تو انہیں نرمی سے سمجھایا جائے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ مردوں کو عورتوں کے ساتھ اچھے برداود کا حکم دیتا ہے

مفہوم:

”عورتوں کے ساتھ اچھا برداود کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں (تب بھی ان سے نباہ کرو) ہو سکتا ہے کہ جس کو تم ناپسند کرتے ہو اس میں اللہ تعالیٰ خیر کشی فرمادے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ایمان کے اعتبار سے کامل ترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ سلوک کرنے والے ہوں۔“

اسلام نے خواتین کو کسی بھی صورت میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ اگرچہ عورت پر معاشی بوجہ نہیں ڈالا گیا لیکن اسے معاشی سرگرمیوں کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہ اپنی عفت کی حفاظت اور گھر بیوڑے داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاشرے میں ایک فعال اور سرگرم کردار ادا کر سکتی ہے۔ صحابیات تجارت، زراعت، گلہ بانی، دست کاری کے شعبے سے وابستہ تھیں اور اپنی آمدن شوہروں پر کوئی علاوه عوامی فلاح کے امور میں صرف کیا کرتی تھیں۔ صحابیات کی غزوہات میں شرکت، بیماروں اور زخمیوں کی خدمت و تیارداری کا بھی احادیث میں ذکر ملتا ہے۔ اسلام نے عورت کو ایک مکمل قانونی اور اخلاقی شخصیت کی عطا کیا پھر اس کے دائرہ عمل اور میدان کارکاعین بھی کیا۔

پہلی بار عورت کو باب اور شوہر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام کی رُو سے عورت کا ایک علیحدہ وجود اور اس کے قانونی حقوق ہیں۔ عورت کی اپنی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور وہ اپنی اس ملکیت میں تصرف کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ انسانی حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام عورت کو ایک محترم اور معتبر وجود مانتا اور کوئی امتیاز نہیں برداشت۔ لیکن عورت کی طبع فطرت اور اس کی عفت و عصمت کے تحفظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند حدود کے پاس و لحاظ کو لازم ضرور قرار دیتا ہے۔

(اس مضمون کی تیاری میں urdu research journal سے استفادہ کیا گیا ہے)

عیسائی مذہب کا بنیادی خیال یہ تھا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے اور جہنم کا دروازہ ہے۔ ”ترتویان“ جو مسیحیت کے اوپرین پیشواؤں میں سے تھا، کہا تھا: ”وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے، وہ شجر منوع کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی اور مرد کو غارت کرنے والی ہے۔“ ”کرائی سوسٹم“ جو عظیم مسیحی امام شمار کیا جاتا ہے، کہا تھا: ”عورت، ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خالقی خطرہ، ایک غارت گرد لر بائی اور ایک آراستہ مصیبت ہے۔“ مسیحیت میں تجداد اور صفائی تعلقات سے کنارہ کشی ہی اصل کمال سمجھا جاتا ہے۔ مسیحی شریعت میں ہر چیز کا مالک مرد تھا۔ طلاق اور خلع کی اجازت نہ تھی۔ مسیحی دنیا کے ملکی قوانین اس بارے میں سخت تھے گویا مسیحی مذہب نے عورت کی تحریر اور اسے پابند یوں میں جلدی رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مسیحی دنیا میں عورت کی زندگی ایک بے بس خلوق اور مرد کے ہاتھ میں کھلونے کے سوا کچھ نہیں تھی۔

☆ بدھ مت:

بدھ مذہب جسے جدید مذہب میں شمار کیا جاتا ہے، نے بھی عورتوں کو بخس ہی قرار دیا۔ اس کا ثبوت ہمیں گوتم بدھ کی تعلیمات میں ملتا ہے۔ گوتم بدھ نے اپنے ماننے والوں سے کہا تھا کہ اگر تم نجات پانا چاہتے ہو تو تمہیں اپنی عورتوں سے تعلق قطع کرنا چاہیے اور سب سے پہلے خود انہوں نے اپنی عورت سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ بدھ مت کے نزدیک عورت سے تعلق رکھنے والا کبھی نزاں حاصل نہیں کر سکتا۔

☆ جین مت:

جین مت کے نزدیک عورت خیر سے عاری اور تمام برائیوں اور منکرات کی اصل جڑ ہے۔ اس لیے یہ مذہب مردوں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ عورت کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلقات استوار نہ کریں۔ نہ عورت کی جانب دیکھیں، نہ اس سے گفت گو کریں۔ جین مت میں اگرچہ ہندو مت کے برعکس عورتوں کو نہ ہی حقوق حاصل ہیں، لیکن وہ عورتوں اور مردوں کو راہبانہ زندگی کی ترغیب دیتا ہے۔ جین مت بھی یوہ کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتا۔

☆ اسلام:

مختلف تہذیبوں، اقوام اور مذاہب میں عورتوں کے مقام و مرتبے کے جائزے سے یہ علم ہوتا ہے کہ عورت ظلم، جبر، ذلت، حقارت، بدسلوکی، تنگ نظری اور جہالت کا شکار تھی۔ لیکن جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو عورت کی زندگی منور ہو گئی۔ اسلام دین فطرت اور عورت کو بہی حیثیت انسان تماں فطری اور جائز حقوق عطا کرتا ہے۔ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان فرق و امتیاز کو ختم کر کے انھیں یک سال عزت، احترام اور وقار سے ہم کنار کرنے کا جو قدم اٹھایا وہ اتنا انقلاب



دنیا بھر میں کورونا کے مریض اب آٹھ لاکھ سے زائد

بھگ ہے اور تین ہزار تین سو چینی شہری کو وہ انیس سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ برطانیہ کے ہسپتاں میں ماسک اور ایک مرتبہ استعمال ہونے والے دستانوں سمیت ایسی طبی اشیاء کی قلت پیدا ہو گئی ہے۔ رسول نے بتایا ہے کہ انہیں کسی تحفظ کے بغیر ہی مریضوں کی دلکشی بحال کرنا پڑ رہی ہے۔ برطانیہ میں کورونا وائرس کی وجہ اب تک چودہ سو سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

ایک دوسری تازہ ترین پیش رفت میں انڈونیشیا نے اپنے ہاں تنام غیر ملکیوں کے داخلے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ دریں اثناء دنیا بھر میں کو وہ انیس سے صحت یاب ہونے والے افراد کی تعداد بھی اب ایک لاکھ بہتر ہزار تک پہنچ گئی ہے۔



انقلابات زمانہ



شہنشاہ ایران رضا شاہ پهلوی کی تیسری اور لاڈی ملکہ فرح دیبا نے انگلستان کا دورہ کیا تو اس وقت لندن کے عالیشان ڈپارٹمنٹل اسٹور، ہیرڈز، میں خریداری کی خواہش ظاہر کی۔

مصیبت یہ تھی کہ وہ اتوار کا دن تھا۔ اور ہیرڈز کی روایت تھی کہ وہ اتوار کے دن ملکہ برطانیہ کی خریداری کے لیے بھی نہیں کھولتے تھے۔

معاملہ گھمبیر ہو گیا۔ کیونکہ ستر کی دھائی میں برطانیہ ایران کے دو بلین پاؤنڈ کا مقروض تھا۔

بکشکل تمام حکومتی دباؤ کے بعد ہیرڈز بطور خاص چند گھنٹوں کے لیے معزز شاہی مہماں کے لیے کھلا جس دوران ملکہ فرح دیبا نے بے تحاشہ شاپنگ کی۔ پھر دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ امریکہ کے اوست درجہ کے سپر مارکیٹ میں۔ فرح دیبا عام لوگوں کی طرح اپنی شاپنگ کارٹ دھکیل کر لائیں میں لگی ہوئی پائی گئیں۔

(وینٹی فیر رسالہ میں شائع ہونے والی خبر سے مانوز)

دنیا بھر میں کورونا وائرس کی نئی قسم کے مریضوں کی تعداد آٹھ لاکھ سے بڑھ چکی ہے۔ ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ اس وبا پر فوری طور پر قابو پانا ممکن نہیں۔

تاہم ماہرین پرماید ہیں کہ پابندیوں کے شہت نتائج سامنے آئیں گے۔

جرمنی کے رو بڑ کو خ اسٹیوٹ کے ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ کو وہ انیس کی وبا کئی ہفتواں بلکہ مہینوں تک جاری رہ سکتی ہے۔ اس ادارے کے سربراہ لوختار ویلر نے عوام سے اس بیماری کے حوالے سے سنجیدہ رو یہ اختیار کرنے کی درخواست کی ہے، ”اگھی تک بہت سے لوگ کو وہ انیس کے خطرے کو سمجھنی نہیں رہے۔“

اس موقع پر لوختار ویلر نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ آنے والے دنوں میں جرمنی میں اس بیماری سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد کافی بڑھ بھی سکتی ہے۔

جرمنی میں اس دوران کورونا کے مریضوں کی تعداد تریٹھ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے جبکہ ہلاکتوں کی تعداد بھی چھ سو کے لگ بھگ ہے۔

دریں اثناء دنیا بھر میں نئے کورونا وائرس کے متاثرین کی تعداد آٹھ لاکھ سے زیادہ ہو چکی ہے جبکہ اس بیماری کی زد میں آ کر اب تک 38 ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس وقت کورونا وائرس سے سب سے زیادہ متاثرہ ملک امریکا ہے جہاں انگلیش کی تعداد ایک لاکھ پیسٹھ ہزار ہے۔

امریکا میں کو وہ انیس کے سب سے زیادہ مریض ریاست نیو یارک میں ہیں۔ امریکا میں اس مرض کی وجہ سے ہونے والی تین ہزار سے زائد ہلاکتوں میں سے تقریباً ایک ہزار ریاست نیو یارک میں ہی ہوئی ہیں۔ اس امریکی ریاست میں یکم مارچ کو پہلے مریض میں کو وہ انیس کی تشخیص ہوئی تھی۔

کورونا وائرس کی اس نئی قسم سے سب سے زیادہ ہلاکتیں اٹلی میں ہوئی ہیں جن کی تعداد گیارہ ہزار چھ سو ہے۔ اس ملک میں ایک لاکھ سے زائد افراد اس بیماری میں بیٹلا ہیں۔ انگلیش اور ہلاکتوں کے اعتبار سے اس کے بعد اپین کا نمبر آتا ہے، جہاں نوے ہزار کے قریب افراد اس کا شکار ہیں اور آٹھ ہزار کے لگ بھگ موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔

اس دوران گزشتہ چوبیں گھنٹوں میں ایران میں کورونا سے مزید 141 شہریوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع ہے، جس کے بعد اس ملک میں ہلاکتوں کی تعداد تقریباً تین ہزار ہو گئی ہے۔ ایران میں کورونا کے مریض 44 ہزار سے زائد ہیں۔ چین میں گزشتہ کئی دنوں سے کورونا کے متاثرین کی تعداد 81 ہزار کے لگ